مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر: ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۸ | صفر المظفر ۱۴۳۹ھ | نومبر ۲۰۱۷ء | شمارہ ۱۱

اتباع المنیب

اہل حق کا اتباع وتقلید

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے   زرسالانہ =/۲۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) مشرّف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

اتباع المنیب

(اہل حق کا اتباع وتقلید)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ.....	۹
۲.....	ناصحین کو نصیحت.....	۹
۳.....	نصیحت کرنے میں اخلاص کی ضرورت.....	۱۱
۴.....	فرمائشی تقریر سے احتراز.....	۱۲
۵.....	مواضع تہمت سے احتراز.....	۱۳
۶.....	مقام اتہام سے بچنا.....	۱۵
۷.....	فیصلہ کرانے سے احتراز.....	۱۶
۸.....	علماء کے لئے قابل احتراز باتیں.....	۱۸
۹.....	دنیا داروں کو نصیحت.....	۱۹
۱۰.....	عوام کی ذمہ داری.....	۲۰
۱۱.....	سفارش اور اس کی حقیقت.....	۲۱
۱۲.....	علماء اور دنیا.....	۲۵
۱۳.....	استمداد بالقبور.....	۲۶
۱۴.....	عوام کے باطل نظریات.....	۲۷
۱۵.....	شبہ کا جواب.....	۲۸

۱۶..... حقوق والدین ۲۹
۱۷..... اتباع کا معنی ۳۰
۱۸..... علماء پر اتہام ۳۲
۱۹..... اخبار بینی ۳۳
۲۰..... خودرائی ۳۴
۲۱..... قانون کے صحیح مفسر ۳۵
۲۲..... ائمہ مجتہدین کی شان ۳۶
۲۳..... علماء اور عوام میں فرق ۳۷
۲۴..... اتباع علماء کی ضرورت ۳۸
۲۵..... آج کل طلباء کا حال ۴۰
۲۶..... جدید مرض ۴۲
۲۷..... حکیمانہ جواب ۴۳
۲۸..... دینی نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ۴۴
۲۹..... اتباع میں غلو ۴۵
۳۰..... بزرگی کے معیار ۴۷
۳۱..... علماء کی کوتاہی ۵۰
۳۲..... حق تعالیٰ کا اتباع ۵۳

۳۳..... تقلید کی حقیقت..... ۵۴

۳۴..... نسبت حنفی کی حقیقت..... ۵۵

۳۵..... محبت کا تقاضا..... ۵۶

۳۶..... حدیث وفقہ میں تعبیر کے اختلاف کی حقیقت..... ۵۷

۳۷..... لباس کی اہمیت..... ۵۷

۳۸..... دین کا اختصار..... ۵۹

۳۹..... معیار اتباع..... ۶۲

۴۰..... قابل اتباع شخص..... ۶۳

۴۱..... امام ابو یوسفؒ کا علمی شغف..... ۶۵

۴۲..... امام محمدؒ کا رنگ تصوف..... ۶۵

۴۳..... کشف وکرامات کی حقیقت..... ۶۶

۴۴..... کیفیت نماز..... ۶۷

۴۵..... درجاتِ احسان..... ۶۸

۴۶..... حاجی صاحب کی تحقیق انیق..... ۶۹

۴۷..... حقیقتِ اشغال..... ۶۹

۴۸..... منیب کا طریقہ..... ۷۱

۴۹..... شریعت کی آسانی..... ۷۱

۵۰..... متبوع کی شناخت ۷۳
۵۱..... سلف اور خلف کا فرق ۷۴
۵۲..... من پسند فتوے کی تلاش ۷۵
۵۳..... سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ۷۶
۵۴..... تقلیدِ شخصی کی ضرورت ۷۷
۵۵..... خلاصہ وعظ ۷۹

وعظ

اتباع المنیب

(اہل حق کا اتباع وتقلید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ ۱۹ صفر ۱۳۳۱ھ کو کھڑہ ابوتراب لکھنؤ شہر میں کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا جو ۴ گھنٹے ۲۵ منٹ میں ختم ہوا سامعین کی تعداد تخمیناً ۲۵۰۰ تھی مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔ اس وعظ میں حضرت نے تقلید کے وجوب کو بیان فرمایا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اس لئے واجب ہے کہ وہ تابعین وصحابہ کے اقوال کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے ہیں جیسے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو ان سے زیادہ سمجھنے والے ہیں اس لئے حضور نے فرمایا: ''علیکم بسنتی وسنة خلفاء الراشدین المهدیین ''اور حضور کا اتباع اصل میں اللہ کے احکام کا اتباع ہے۔ اس لئے حنفی اور شافعی کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور کے اتباع کو چھوڑ کر ان کا اتباع کیا جاتا ہے بلکہ ان کا اتباع عین اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے ہیں جیسے حضور کا اتباع عین اللہ کے احکام کا اتباع ہے کہ وہ قرآن کو اور اللہ کے حکم کو سب سے زیادہ سمجھنے والے ہیں لہٰذا حنفی وشافعی کی نسبت کو کفر وشرک کہنا درست نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہمِ صحیح عطا فرمائے اور اس وعظ کو سمجھ کر اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی

۲۵/۷/۲۰۱۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۖ وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾(۱)

ناصحین کو نصیحت

یہ ایک آیت ہے سورۃ لقمان کی۔ اس وقت اس کے تمام اجزاء کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک جملہ کا بیان مقصو ہے۔ مگر برکت کے لئے نیز ادب کے لئے پوری آیت تلاوت کی گئی۔ مقصود صرف وَاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ کا بیان کرنا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں اور خطاب عام ہے کہ اتباع کرو ان کے طریقہ کا جو میری طرف رجوع کریں۔ یہ اس آیت کا ترجمہ ہے اور

(۱) ''یعنی اور اگر تجھ پر وہ دونوں (یعنی والدین) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف رجوع کرنے والا ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جتلادوں گا جو کچھ تم نہ کرتے تھے'' (سورۃ لقمان:۱۵)۔

اس کے ماقبل اور مابعد بھی اسی کے مناسب مضمون ہے اور تمہید کے طور پر اس کا بیان بھی کروں گا مگر مقصود وہی جملہ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (ان کے طریقہ کی اتباع کرو جو میری طرف رجوع کرتے ہیں) ہے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے لقمان علیہ السلام سے کچھ حکمتیں نقل کی ہیں جن کی انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی اور جملہ حکمتوں کے ایک نصیحت ادائے حقوق والدین کی بھی نصائح ضروریہ میں سے تھی جو کہ حضرت لقمان نے بیان نہیں کی تھی یا تو اس لئے کہ انہیں حق تعالیٰ کے حقوق کا بیان کرنا مقصود تھا اور یا اس لئے کہ انہوں نے خودغرضی کے ایہام سے اس کا بتلانا مناسب نہ سمجھا ہو اور اس سے پہلو تہی کی ہو مگر چونکہ بغیر اس کے مضمون ناتمام رہا جاتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے درمیان میں اس کو ذکر کر دیا اور جس آیت سے اس کو شروع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے کیونکہ شروع میں فرمایا ہے وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ الآیۃ (ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے) متکلم کے صیغہ سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ یہ نصیحت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے حضرت لقمان سے منقول نہیں ہے اور اس سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ نصیحت میں خودغرضی کے ایہام سے بھی بچنا مناسب ہے جیسا کہ لقمان علیہ السلام نے کیا کیونکہ حقوق والدین کی نصیحت سے چونکہ اپنے بیٹے کو نصیحت فرما رہے تھے ایہام (۱) خودغرضی کا ممکن تھا پس خودغرضی کے ایہام سے بچنا چاہئے کیونکہ اکثر ایسی صورت میں مخاطب کے قلب پر اس نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور یہ ایک اصل کلی اور قاعدہ کلیہ ہے اس کے فروع اور جزئیات بہت ہیں جن کی آج کل ضرورت واقع ہوتی ہے اور یوں تو ہر اصل کے فروع بہت سے ہوتے ہیں مگر اس اصل کے خاص وہ فروع بھی متعدد ہیں

(۱) خودغرضی کا شبہ ہوتا ہے۔

جن سے اکثر مسابقہ پڑتا ہے۔

نصیحت کرنے میں اخلاص کی ضرورت

چنانچہ ایک فرع یہ ہے کہ اکثر لوگ وعظ یا نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے گروہ کو قوت ہو۔ آج کل یہ عام طور پر ہو رہا ہے ہر چند اس میں نیت بخیر بھی ہوتی ہے کیونکہ اپنے کو حق پر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر لانا چاہتے ہیں مگر اپنی غرض یہی ہوتی ہے نیت یہ ہوتی ہے کہ مجمع اہل حق کا بڑھے گا تو ہم کو قوت ہوگی۔ گو یہ نیت نہ ہونے کی صورت میں قوت حاصل ہوتی مگر اس کے قصد اور لزوم میں بڑا فرق ہے پس قصد اور نیت تو یہ نہ ہونی چاہئے گو یہ بات لازم آجائے بلکہ نیت تو یہ ہونی چاہئے کہ لوگ حق کو قبول کریں اس میں برکت ہوتی ہے اور مجمع اہل حق کو قوت اور ترقی بھی ہوتی ہے اور جب براہ راست مجمع بڑھانے کی ہی نیت ہو گو وہ مجمع اہل حق کا ہی سہی مگر یہ تجربہ ہے کہ اس کا اثر سامعین پر ضعیف ہوتا ہے بلکہ بعض وقت مقصود کے خلاف اور برا اثر ہوتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایسا ملکہ اور ایسی فہم عطا کی ہے کہ نیت اور مقصود اس سے مخفی نہیں رہتا پس سامعین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں کیا مقصود ہے پس ویسا اثر بھی ہوتا ہے لہٰذا ناصحین کے لئے ضروری ہے کہ بے غرض ہو کر تبلیغ کریں۔

تبلیغ سے مقصود صرف یہ ہو کہ مخاطب کو نفع ہو۔ اب اس نفع سے چاہے جو کچھ بھی لازم آجائے یہ ایک فرع تھی اس اصل مذکور کی۔

اب دوسری فرع سنیئے کہ اس کا بیان بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اس میں اہل علم کی اصلاح ہے اور ہم کو عوام سے زیادہ اہل علم کو مشورہ دینے کی ضرورت ہے اس لئے کہ عوام کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ان کی اصلاح ہوگئی تو عوام کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔ اور اگر ان میں کمی ہوگی تو ان کا اور ان کی بات

کا اثر بھی ویسا ہی ناقص متعدی (دوسرے تک پہنچنے والا) ہوگا جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا۔ پس ضرورت معلوم ہوئی کہ اس اصل سے جو مسئلہ خواص کے مناسب مستنبط ہوتا ہے اس کا بھی اختصار کے ساتھ ذکر ہو جائے۔

فرمائشی تقریر سے احتراز

سو وہ یہ ہے کہ بعض اوقات علماء کسی خاص شخص کے فرمائشی مضمون پر وعظ کہتے ہیں چاہے وہ مجمع کے مناسب ہو یا نہ ہو تو ایسا بھی نہ کرنا چاہئے اور مجھ کو یہ باتیں پیش آتی ہیں اس لئے میں کہتا ہوں چنانچہ ایک مقام پر مجھ سے کہا گیا کہ ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرنا کیونکہ اس مقام پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ نعوذ باللہ حضور کی عظمت کم کرتے ہیں مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کیونکہ اس سے مخاطب کو کیا نفع ہوا۔ اس لئے کہ مخاطبین میں کوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا منکر نہیں تو اس مجمع میں اس مضمون کو بیان کرنے سے سوائے اس کے کیا غرض ہے کہ اپنے کو خوش عقیدہ اور نیک خیال ظاہر کر دیں تو دو گھنٹہ وقت صرف کروں اور حاصل یہ ہو کہ ہم کو بزرگ سمجھیں۔

ایک مقام پر جودھپور میں یہ رائے دی گئی کہ بعض لوگ تمہاری جماعت پر عدم تقلید کا شبہ کرتے ہیں اس لئے امام ابوحنیفہ کے فضائل کا ذکر کرو۔ میں نے کہا کہ اس بیان سے بجز اس کے کہ اپنا تبریہ (پاکی بیان کرنا) ہو اور کیا حاصل ہے اور میں نے کہا کہ مجھے تو غیرت آتی ہے کہ چند مسلمان اشتیاق کے ساتھ احکام سننے کے لئے آئیں اور بجائے اس کے اپنی عقیدت ان کے ذہن میں جمائی جائے۔ رہی یہ بات کہ ہماری طرف سے ان کا گمان بد ہے تو ہوا کرے ہم اپنا فرض ادا کرتے ہیں کسی کی سمجھ میں آئے تو عمل کرے ورنہ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ

عَلِیْم (ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا موجود ہے)۔

پس اس قسم کے خیال اکثر مصلحت کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا کرنے لگتے ہیں اس لیے میں اس کو بیان کرتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں۔ اس میں خود غرضی کا شبہ ہے اگر کسی کو واقعی آپ کے متعلق تحقیق کرنی ہوگی وہ دوسرے ذرائع سے کرے گا۔ باقی اپنے منہ سے اپنا تبریہ (پاکی بیان کرنا) یہ بالکل تہذیب اور مروت کے خلاف ہے بلکہ خود تو یہ کہنا چاہئے کہ ہم اس سے بھی بدتر ہیں اور اس اصل سے ایک اور فرع غامض (باریک) سمجھ میں آئی کہ علماء کے لئے مناسب یہ ہے کہ تعلقات دنیویہ میں زیادہ مشغول نہ ہوں اور یہ بات شاید اول وہلہ (۱) میں عقلاء کی سمجھ میں نہ آئے مگر میں اس کو سمجھائے دیتا ہوں کیونکہ آج کل عقل کی بہت پرستش ہوتی ہے (۲) جب تک کہ کوئی بات ان کی عقل میں نہ آئے اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرتے اور اس قسم کی باتوں کو آج کل تنزل (۳) کی تعلیم کہا جاتا ہے مگر الحمدللہ میں علماء کو کہہ رہا ہوں اور وہ اس کو تنزل نہ کہیں گے۔

مواضع تہمت سے احتراز

تو بات یہ ہے کہ جو علماء دنیا کے کاروبار کرتے ہیں ان کی بابت معلوم ہوا ہے کہ اُن معاملات کے متعلق جب وہ کوئی فتویٰ بیان کرتے ہیں تو لوگ اس کی وقعت نہیں کرتے۔ چنانچہ اسی کی بناء پر عوام کی زبان زد ہے کہ مولوی اپنے مطلب کے فتوے نکال لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ دنیوی جھگڑے ہیں اس وجہ سے لوگوں کو ان پر اعتماد نہیں اور یہ جھگڑے نہ ہوں تو ان کی سختی احتیاط پر

(۱) ابتدائی مرحلہ میں (۲) پوجا (۳) احساس کمتری۔

محمول ہوگی اور نرمی واقفیت زمانہ پر محمول ہوگی غرض ہر حال میں وہ محمود ہوں گے(۱) اور گو یہ محمود ہونا مقصود نہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ان سے لوگوں کو فائدہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو مریض گیا گزرا۔ پس طبیب کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی بات ایسی نہ کرے کہ مریض کا اس پر سے اعتماد جاتا رہے اور مریض اس سے بدگمان ہوجائے اور یہی معنی ہیں اتقوا من مواضع التهم (یعنی تہمت کے موقعوں سے بچو) کے اس کو پہلے مضمون کے متعارض نہ سمجھیئے کہ پہلے کہا تھا کہ کسی کا ہماری طرف سے گمان بد ہو تو ہوا کرے، کیونکہ مواضع التهم (تہمت کی جگہیں) کہا ہے۔ بچنے کے امر میں یہ قید ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی کام ایسا نہ کرے کہ بدگمانی ہو اور وہاں محض اظہار حق ہی سے جو کہ مامور بہ ہے(۲) بدگمان ہوئے ہیں تو وہ ایسا ہوگیا کہ۔ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ یعنی ان کفار نے ان مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ زبردست سزاوار حمد ہے(۳)۔

تو وہاں وہ فعل مامور بہ اور سراسر محمود ہے اور یہاں ایسے امور ہیں کہ ضروری نہیں ہیں، ان سے بچنا ممکن ہے۔ پس اگر ان سے نہ بچے گا تو لازم آئے گا کہ خود اپنے آپ سے لوگوں کو بدگمان کیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علماء اپنی جائیدادیں تلف کردیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں جو توسیع ہوتی ہے اس سے بچیں کیونکہ وہ غیر ضروری ہے۔ پس غیر ضروری کے لئے متہم ہونا(۴) مناسب نہیں۔ یہ وجہ ہے جس کے لئے میں کہتا ہوں کہ اہل علم کے لئے تقلیل تعلقات (تعلقات میں کمی کرنا) مناسب ہے تو یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے کیونکہ اس میں خود غرضی کے ایہام سے بچنے کو کہا گیا ہے اور توسیع تعلقات کی صورت میں نصیحت کرنے سے خود غرضی کا

(۱) اچھے سمجھے جائیں گے (۲) جس کا حکم دیا گیا ہے (۳) جس کی خوب تعریف ہونی چاہیئے (۴) تہمت اٹھانا۔

ایہام ہوتا ہے پس اس ایہام سے بچنا لازم ہے اور اس سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ توسیع تعلقات کو ترک کیا جائے نہ یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر (یعنی اچھے کام کا امر کرنا اور بری باتوں سے روکنا) ہی کو ترک کر دیا جائے کیونکہ وہ تو مامور بہ ہے(۱) پس یہ بھی اسی کی ایک فرع ہوئی یہ طلباء کے کام کی بات ہے کیونکہ یہ پڑھ کر مقتداء بنیں گے اس وقت ان کو اس سے فائدہ ہوگا۔

مقام اتہام سے بچنا

ایک فرع یہ بھی ہے کہ اہل علم کو کبھی کسی کا فیصلہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اس سے بھی بدگمانی ہوتی ہے جس کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ ان سے بدگمان ہوجاتا ہے اور مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کیونکہ اول میں بعض مواقع میں مجھ سے ایسی غلطی ہوگئی ہے کہ میں نے فیصلہ لے لیا ہے مگر اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا پھر مجھے تجربہ ہوگیا۔

چنانچہ پہلے پہلے جب میں وطن گیا تو لوگ اپنے فیصلے لاتے تھے۔ ایک مکان کا فیصلہ تھا میں نے محنت کر کے جزئیات فقیہہ تلاش کیں اور اس کے موافق فیصلہ لکھا مگر جس کے خلاف تھا اس نے اس کو نہیں مانا وہ معاملہ سرکار میں لے گئے۔ میرے فضول کئی دن اس میں برباد ہوئے۔

ایک اور فیصلہ تھا کہ اس میں ایک فریق تو ایک عورت تھی اور دوسرا فریق ایک مرد۔ اس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بس دو ہی مرتبہ میں مجھے تجربہ ہوگیا کہ اہل علم کو ہرگز فیصلے میں نہ پڑنا چاہئے۔ اس وقت سے میں نے یہ تجویز کر لی ہے کہ جو میرے پاس فیصلہ لاتا ہے اس سے کہہ دیتا ہوں کہ فیصلہ تو عمائد کے پاس لے جاؤ انہیں سے فیصلہ کراؤ۔ لیکن اگر وہ مسائل اور احکام شریعت سے واقف نہ ہوں تو اس

(۱) ان کو کرنے کا تو حکم دیا گیا ہے۔

وقت یہ ہونا چاہئے کہ فریقین متفق ہوکر ایک استفتاء لکھیں جس پر دونوں کے دستخط ہوں اور اگر استفتاء کے مضمون میں فریقین کا اتفاق نہ ہو تو اس میں بھی عمائد سے رجوع کریں تاکہ وہ تنقیح کرکے (۱) استفتاء کے مضمون کو درست کریں اور جب مضمون منقح ہوجائے تو اس پر دونوں فریق دستخط کریں اور میرے پاس لائیں تو میں جواب لکھ دوں گا تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک نے کچھ اپنے موافق لکھ کر فتویٰ حاصل کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہو کہ پھر دونوں کو عدالت میں جاکر کھڑا ہونا پڑے اور وہ فتوے بیکار ہوجائیں اور بدنامی بھی ہو کہ کوئی مولوی کچھ لکھتا ہے اور کوئی کچھ لکھتا ہے پس بہتر یہ ہے کہ فتویٰ تو لیں علماء سے اور اس کو نافذ کرائیں عمائد اہل شہر سے کیونکہ فیصلہ کرنا عمائد اور اہل اثر کا کام ہے۔ میں نے یہ معمول اختیار کیا ہے۔

فیصلہ کرانے سے احتراز

فیصلہ لینے میں ضرر یہ دیکھا کہ جب دو فریق باہم مخالف ہوکر فیصلہ کرکے قضیہ لائیں گے تو ضروری بات ہے کہ فیصلہ ایک کے موافق ہوگا اور دوسرے کے خلاف تو بعض اوقات تو وہ فیصلہ واقع کے موافق ہوتا ہے اور بعض مرتبہ واقع کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ فیصلہ کرنے والا عالم الغیب تو نہیں ہے کہ اس کو صحیح واقعات کا علم ضروری ہو۔ پس ممکن ہے واقعات اس فیصلہ کرنے والے سے مخفی رہیں اور معلوم نہ ہوسکیں ہر چند کہ ایک فریق ظاہر کرتا ہے مگر دلیل نہ ہوسکنے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں ہوتا پس اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہوا تو عوام گالیاں دیتے ہیں کہ یہ کیا اندھوں کی طرح فیصلہ کیا ہے بس معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کردی ہے اس وجہ سے ایسا فیصلہ کردیا۔ سو یہ نتیجہ ہوتا ہے اور ہارنے والے کو اس روز سے اس مقتداء سے دینی تعلق کم ہوجاتا ہے جس سے اس کا دینی ضرر ہوا۔

(۱) چھان پھٹک کرکے۔

اگر فیصلہ واقعات کے خلاف ہے تب تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے اور اگر واقعات کے مطابق بھی ہو جب بھی اکثر لوگ اس فیصلہ کرنے والے کو ایک فریق کے ساتھ ضرور سمجھتے ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں اس کا دینی اثر ہونا ممکن تھا وہاں بھی یہ لوگ اس میں کھنڈت(۱) ڈالتے ہیں اور ان کو اس کی طرف سے بدگمان کرتے ہیں۔ اس کا وہ قصہ ہوجاتا ہے کہ۔

غضب ایک شیر کے واسطے تونے نیستاں کو جلادیا

ایک ذرا سے فائدہ کے لئے کہ فیصلہ کرنے سے ہمارا لوگوں میں اثر ہوگا جس سے دینی کام لیں گے۔ بہت لوگوں کو اپنے سے بدگمان کرلیا اور ان پر جو دینی اثر ہوتا اس کو غارت کردیا۔ اور عجب نہیں کہ حضرت ابوذر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے یہ مشورہ دیا ہو کہ۔

لا تلين مال يتيم ولا تقضين بين اثنين (اتحاف السادة المتقين۔۸/۳۱۸)

یہ حدیث طویل کا ایک جزو ہے۔ اس میں یہ مضمون ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے فرمایا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارے لئے وہی پسند کرتا ہوں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ایک تو یتیم کے مال کا متولی نہ بننا۔ دوسرے تم پنچ نہ بننا اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ انی اراك ضعيفا کہ تم ضعیف ہو ان کاموں کا تحمل نہیں کرسکو گے اور عدم تحمل کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ نازک تھے پس جب فیصلہ کرنے کے بعد کوئی مخالفت کرے گا تو پریشان ہوجائیں گے اور ان کی مخالفت اور اعتراضات کا تحمل نہ کرسکیں گے برخلاف اس کے کہ فیصلہ کرنے والا صاحب حکومت ہو جیسے شیخین کہ ان کے فیصلے کی اول تو مخالفت نہیں کی جاتی اور اگر کی جائے تو وہ مخالفت کو رفع فرماسکتے ہیں برخلاف ایک ایسے بزرگ کے جس کو

(۱) رکاوٹ۔

اختیارات حاصل نہ ہوں کہ وہ مخالفت کو رفع نہیں کر سکتے۔ پس یہ بھی اس اصل کی ایک فرع ہوسکتی ہے کہ خودغرضی کے ایہام سے بچیں۔

علماء کے لئے قابل احتراز باتیں

فقہاء نے ایسا ہی ایک جزیہ لکھا ہے کہ علماء کو گواہی دینا مناسب نہیں اور وجہ یہ لکھی ہے کہ اگر یہ کسی کی طرف سے گواہی دیں گے تو فریق مقابل کو ان سے عداوت ہوجائے گی لہٰذا ان کو گواہی دینا مناسب نہیں ہے۔ پس فقہاء کے اس قول سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ علماء کو فیصلہ نہ لینا چاہئے اور فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو مناسب نہیں کہ ہر جگہ کی دعوت قبول کرلیں۔ پس جب انہوں نے دیکھا کہ عوام کا علماء سے کتنا تعلق ہے اور ان کا منصب کیا ہے تو یہاں تک مشورہ دیا کہ ہر جگہ کی دعوت بھی نہ قبول کی جاوے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ لوگ دعوت کر کے حقیر سمجھتے ہیں اور طلبہ کی دعوت تو آج کل اسی خیال پر کرتے ہیں کہ بلائیں دفع ہوں گی۔ تو گویا طلبہ بلاخوار ہوئے۔

عوام کے اس خیال کے قرائن یہ ہیں کہ اکثر صدقہ میں عوام نے کالی چیزیں پسند کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تیل اور ماش دیتے ہیں اور پھر اس کے لئے تجویز کیا ہے مہتروں کو کہ وہ بھی اکثر کالے ہوتے ہیں۔ پس اس شدت کے ساتھ کالے ہونے کی رعایت کرنے سے معلوم ہوا کہ اس بلا کو صدقہ میں لپٹا ہوا خیال کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جو شخص اس کو کھائے گا بلا اس کے ساتھ چلی جاوے گی تو ایسوں کو تجویز کرو جن کے ضرر پہنچنے سے کوئی رنج نہ ہو۔ اس لئے کہیں تو مہتروں کو تجویز کیا اور کہیں طلباء کو تجویز کیا کہ طلباء سے زیادہ کون مفت کا ہوگا تو یہ حال ہے لوگوں کا۔

میں نے تو اسی لئے اپنے یہاں یہ طریقہ مقرر کر دیا ہے کہ طلباء کو دعوت میں جانے کی اجازت نہیں بلکہ بعض لوگوں نے طلباء کا کھانا اپنے یہاں مقرر کرنا چاہا تو میں نے کہہ دیا کہ اگر اپنے ملازم کے ہاتھ دونوں وقت مہذب طریقہ سے بھیج سکو تو منظور کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ طلباء تمہارے در پر کھانا لینے کے واسطے نہ جائیں گے تو وجہ یہ ہوئی کہ عوام کی حالت سے میں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ وہ ان کی تذلیل کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کو اپنی حفاظت کی ضرورت ہے۔

دنیا داروں کو نصیحت

عوام اہل علم کی نسبت بالکل یہ سمجھتے ہیں کہ چندیں شکل برائے اکل (اتنی شکلیں کھانے کے لئے ہیں) کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں سب اپنے کھانے کے لئے کرتے ہیں۔ کوئی مدرسہ قائم کرے اور اس کی خدمت اور امداد کے لیے چندہ کرے مگر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اپنے لیے وصول کرتے ہیں اور مدرسہ کا صرف بہانہ ہے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کو اس میں ہرگز نہ پڑنا چاہئے بلکہ علماء تو پڑھائیں اور چندہ کریں اہل دنیا۔ مگر اہل دنیا نے اس کام کے لیے بھی علماء ہی کو تجویز کیا ہے سو کام تو سارے علماء کریں اور دنیا دار صرف ان پر الزام لگانے کے لیے ہوں۔ اور افسوس ہے کہ جتنی کچھ مضرتیں پہنچ رہی ہیں ان سب کا الزام علماء پر لگایا جاتا ہے۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان کو چاہئے کہ تبلیغ اسلام میں سعی کریں اور دنیا کا کچھ کام نہ کریں مگر اس میں علماء کوتاہی کرتے ہیں کہ غیر ممالک میں تبلیغ کرنے نہیں جاتے بلکہ دنیا کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ آخر علماء کہاں سے کھائیں اس وقت تو جو صورت کسی کو میسر ہوئی اس میں مشغول ہیں کہ

کوئی مطب کر رہا ہے کوئی کچھ کر رہا ہے حالانکہ اہل علم اس سے تنگ ہیں مگر کیا کریں۔ پس یہ حضرات جو رائے دیتے ہیں ایک مد بھی تو ایسی کھول دیں جس سے اہل علم کی کفالت ہوتی رہے اور اس وقت تو علماء اپنی معاش کی بھی فکر کرتے ہیں اور جتنی ہوسکتی ہے دین کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ یہ حضرات علماء کو رائے تو دیتے ہیں اور جب ان سے علماء کے کھانے کی صورت پوچھی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ چندہ کریں۔ تو مولویوں کو اکبر کے بھانڈ کا ہاتھی مقرر کیا ہے۔

مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا اور اس کی خوراک کے لیے کچھ نہیں دیا۔ پس اس بھانڈ نے یہ کیا کہ جب اکبر کی سواری ادھر کو نکلی تو اس طرف اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر کی سواری جب وہاں پہنچی اور اس ہاتھی کو اس حالت میں دیکھا تو اس بھانڈ کو بلایا دریافت کیا کہ تو نے ایسا کس واسطے کیا۔ اس نے کہا کہ میرے اندر اتنی وقعت کہاں ہے کہ اس کو اپنے پاس سے کھلاؤں۔ اس لئے میں نے اس کے گلے میں ڈھول ڈال دیا ہے کہ بھائی جیسے ہم مانگ کر کھاتے ہیں اسی طرح تو بھی مانگ اور کھا۔

عوام کی ذمہ داری

اب ہمارے بھائی علماء کے لیے یہی منصب تجویز کرتے ہیں کہ مانگو اور کھاؤ کتنی بڑی غیرت کی بات ہے یہ تو آپ غنیمت سمجھتے نہیں کہ علماء آپ کو تنگ نہیں کرتے اور تقاضا نہیں کرتے حالانکہ ان کا حق ہے اس لیے وہ تقاضا کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کے ذمے ان کا دین ہے(۱) حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا﴾ کہ صدقہ ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ کے کام میں گھرے ہوئے

(۱) قرض ہے۔

ہیں۔ وہ نہ تجارت کرتے ہیں نہ زراعت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوتے تو لِلْفُقَرَآءِ میں لام استحقاق کا ہے کہ ان کا حق ہے تو حق تعالیٰ کی تصریح سے ان کا قرض دیانتاً واجب ہے پس جب کہ ان کا حق ہے تو وہ مطالبہ بھی کرسکتے ہیں مگر غیرت علم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ علم وہ چیز ہے کہ صاحب علم کے دماغ میں اس سے علو اور استغناء پیدا ہوجاتا ہے۔ اور یہ جو لوگ اس وقت ادھر اُدھر وعظ کے ذریعہ سے مانگتے اور علماء کے طبقہ کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں ان میں دینداری تو کیا استعداد علمی بھی نہیں ہے تو یہ علماء نہیں ہیں۔ بس یہی ہے کہ ادھر اُدھر کے مضامین یاد کرلئے ہیں۔ اب انہی پر لوگ اور علماء کو بھی قیاس کرتے ہیں حالانکہ جو عالم ہوگا گو باعمل نہ ہو پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے علم کی تذلیل نہ کرے گا اس لیے وہ کونے میں پڑے ہیں نہ تقاضا کرتے ہیں نہ مطالبہ اس حالت کو غنیمت نہیں سمجھتے بلکہ ان پر اعتراض کرکے ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم بھی ہمارے عیب نکالو پس یہ رائے بالکل نامناسب ہے کہ علماء چندہ مانگیں چندہ تو اور لوگوں کو کرنا چاہئے یہ کام علماء کا نہیں ہے کیونکہ اس میں علماء پر خودغرضی کا شبہ ہوتا ہے چنانچہ علماء جب چندہ مانگتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ چندہ وصول کرکرا کے اپنے پاس رکھ لیں گے پس علماء کو چاہئے کہ اس سے بچیں تو یہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے۔

سفارش اور اس کی حقیقت

ایک فرع اس کی یہ ہے کہ پیر کو چاہئے کہ اپنے مریدوں کے دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے کیونکہ اس میں بھی خودغرضی کا شبہ ہوجاتا ہے پھر ان کے

معاملات میں سے جو کھلی معصیت ہوں اس میں تو نہ پڑنا اور شرکت نہ کرنا ظاہر ہے اور جو معاملہ ایسا ہو کہ اس کو اس کی تحقیق نہیں تو اس میں بھی نہ پڑے کہ اس کی تفتیش شروع کردے اور اسی میں داخل ہے اپنے معتقدوں کی سفارش کرنا۔ آج کل سفارش بھی نہ کرنا چاہئے اس میں بھی خود غرضی کا شبہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں سفارش سفارش نہیں رہی۔ سفارش کی حقیقت ایک قصہ سے معلوم ہوگی۔

وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرہؓ لونڈی تھیں۔ حضرت عائشہ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا اور شرعی قانون یہ ہے کہ لونڈی جب آزاد ہو تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے خاوند سے الگ ہو جائے۔ پس جب یہ آزاد ہوئیں تو اپنے شوہر سے علیحدہ ہوگئیں حضرت مغیث ان کا نام تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ روتے ہوئے ان کے پیچھے پھرتے تاکہ حضرت بریرہؓ ان سے الگ نہ ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس پر تعجب ہے کہ مغیث تو بریرہ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں اور بریرہ مغیث سے اس قدر بغض رکھتی ہیں۔ چنانچہ پھر بہ نفس نفیس خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے مغیث کی سفارش کی کہ ان سے علیحدہ مت ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ سفارش کرتے ہیں یا امر کرتے ہیں(۱)۔ آپ نے فرمایا کہ امر تو نہیں کرتا۔ پس انہوں نے جواب دیا کہ جب امر نہیں ہے تو میں قبول نہیں کرتی۔

حضرت بریرہؓ کیسی قانون دان تھیں کہ دریافت کرلیا کہ امر ہے یا سفارش۔ اگر امر ہو تو اس کو قبول کرنا لازم ہے اور سفارش ہو تو نہیں۔ یہ ہے آزادی خیال تصور کیجئے کہ کجا بریرہ اور کجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم (۲)۔ مگر نہایت آزاد ہو کر

(۱) یا حکم دیتے ہیں (۲) کہاں بریرہ اور کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔

سوال کرتی ہیں کیونکہ جانتی ہیں کہ شریعت نے جو دعویٰ کیا ہے اسی پر عمل بھی ہے اور یہ بھی ایک بڑا فرق ہے شریعت اور دوسرے قوانین میں کہ شریعت میں دعویٰ کے ساتھ عمل بھی ہے اور دوسری جگہ دعویٰ تو ہے مگر اس کے ساتھ عمل نہیں۔

مثلاً مساوات کہ اس وقت اصول تمدن میں ہے اور اسی کی ایک شاخ خبط آمیز یہ نکلی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہوں سو ان لوگوں نے مساوات کا مطلقاً دعویٰ کیا ہے اور شریعت بھی ایک حد کے اندر مساوات کا دعویٰ کرتی ہے لیکن شریعت کے دعویٰ میں اور دوسرے لوگوں کے دعویٰ میں دو فرق ہیں ایک تو یہ فرق ہے کہ شریعت نے مطلق مساوات کا دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی ایک حد مقرر کر دی ہے اور دوسرے لوگ مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں اور دوسرا فرق یہ ہے کہ شریعت میں عمل بھی ہے کہ جو متبع شریعت ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں میں جو مساوات مطلقہ کے مدعی ہیں ان میں عمل نہیں۔

تو شریعت نے جو قانون مقرر کیا ہے عمل کرنے کے لیے مقرر کیا ہے کہ ادنیٰ رعیت سے لے کر پیغمبر تک کو اس پر عمل کرنا ہوگا۔ خیال تو کیجئے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کرتے ہیں اور حضرت بریرہؓ اس پر سوال کرتی ہین کہ امر ہے یا سفارش ہے اور جب کہا جاتا ہے کہ امر نہیں ہے سفارش ہے تو وہ کہتی ہیں کہ میں نہیں مانتی۔ اب تو کوئی کسی استاد سے یا کسی پیر سے یا باپ سے ایسا کر کے دیکھے غرض یہ کہ اس قصے سے سفارش کا درجہ معلوم ہو گیا کہ سفارش یہ ہے کہ جس کے پاس سفارش لے جائیں اس کو مجبور نہ ہونا پڑے خلاصہ یہ کہ اس پر زور نہ ڈالا جائے۔

اب آج کل سفارش دیکھئے کہ اول ہی سے زور دار الفاظ کی فکر ہوتی ہے حالانکہ سفارش کے لیے لازم ہے کہ زور نہ ہو اور یہ قاعدہ ہے کہ اذا انتفی اللازم

انتفی الملزوم۔ یعنی جب لازم نہ ہو تو ملزوم بھی نہیں ہوسکتا تو جب سفارش کے لیے زور نہ ہونا لازم ہے اور اب زور ڈالا جاتا ہے جو لازم کا نقیض ہے تو لازم نہیں پایا گیا، پس ملزوم بھی نہیں ہوسکتا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ آج کل کی سفارش سفارش نہیں رہی۔

دوسرے سفارش کی یہ بھی پہچان ہے کہ اگر وہ شخص اس کو قبول نہ کرے تو اس سفارش کرنے والے کو گراں نہ ہو اور نہ اس کے دل میں رنج ہو لیکن آج کل کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ شخص سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے والے کو بہت صدمہ ہوتا ہے اور بے انتہا گراں ہوتا ہے پس سفارش کی جو علامت تھی وہ بھی نہیں پائی جاتی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں ڈھاکہ گیا اور نواب صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ اب لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ میری آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اس لیے وہ مجھ سے سفارشیں کرائیں گے۔ پس اگر کوئی مجھ سے آپ کے پاس سفارش لکھوا کر لائے تو آپ اس سے مجبور ہوکر اپنے مصالح کے خلاف نہ کریں۔ انہوں نے ایک عجیب بات کہی کہ میں اس پر عمل ہی نہ کروں گا تاکہ لوگ جلدی ہی آپ کو دق کرنا چھوڑ دیں۔

پس یہ ہے سفارش کہ مخاطب کو بالکل آزادی ہو۔ اس پر کسی طرح کا جبر اور دباؤ نہ ہو۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ آج کل کی کیا حالت ہے۔ سفارش کرنے والے کس قدر زور اور دباؤ ڈالنے کی فکریں کرتے ہیں اور اگر وہ ان کی سفارش پر عمل نہ کرے تو تمام عمر شکایت رہتی ہے کہ ہماری بے قدری ہوئی اللہ آج کل کے لوگوں کی سفارش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے بھی زیادہ ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش کو تو بریرہؓ کہیں کہ میں نہیں مانتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی بے قدری نہ وہ اور آج کل اگر سفارش نہ قبول ہو تو بے قدری ہوتی ہے تو اس قسم کے قصوں میں پڑنا مناسب نہیں ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش بری چیز ہے بلکہ اس لیے کہ اب وہ سفارش نہیں رہی البتہ اگر ایسے قیود اس میں مصرح ہوں جس سے مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ ان کا دباؤ ڈالنا مقصود نہیں مثلاً یہ کہ واللہ اگر قبول نہ کرو گے تو ہم برا نہ مانیں گے۔ اور تم اپنی طبیعت پر بار نہ ڈالنا اگر ایسی صفائی سے کی جاوے گی تو جائز ہے۔ لیکن اگر ایسا کرو تو خط لے جانے والا یہیں رکھ دے۔ پس ملاحظہ فرمائیے سفارش سفارش نہیں رہی ورنہ سفارش تو موجب اجر ہے اس سے کیسے ممانعت ہو سکتی ہے۔

غرض آج کل علماء اور مشائخ کو زور ڈالنا مناسب نہیں ورنہ اس سے خود غرضی کا شبہ ہوگا کیونکہ اس کی غرض آپ کی غرض سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے سفارش کے قبول کرنے میں ان پر احسان سمجھا جاتا ہے تو ان کو مناسب نہیں کہ کسی کے احسان کو اپنے اوپر لیں۔ اگر اس شخص کے ساتھ احسان ہی کرنا ہے تو مناسب ہے کہ خود ہی احسان کریں اور اس کی حاجت پوری کرنے کو دوسرے کو نہ کہیں کہ وہ ان پر احسان رکھے۔

علماء اور دنیا

اسی طرح علماء کو لوگوں کے رشتہ ناتوں میں بھی نہ پڑنا چاہیے اور مجھے سفارش کرانے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ بزرگوں کو انہیں قصوں کا کرلیا ہے گویا انہوں نے تسبیح اسی لیے لی ہے کہ لوگوں کی دنیا کو درست کیا کریں۔ جس نے اپنی دنیا پر لات ماردی ہے اسے دوسروں کی دنیا درست کرنے سے کیا غرض۔ ان کے پاس دنیوی جھگڑے لے جانے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے سنار سے کوئی شخص

کھر پا درست کراوے۔ سو علماء اور مشائخ تو صرف اس کام کے ہیں کہ ان سے شریعت کے احکام اور مسائل پوچھو۔ امراض باطنی کا ان سے علاج کراؤ۔ یہ کیا واہیات بات ہے کہ لڑکی کا رشتہ کراتے ہیں وہ لوگ اس کام کے نہیں۔

استمداد بالقبور

یہاں سے بطور فرع کے سمجھ میں آیا ہوگا کہ جب زندوں سے دنیا کے کام لینا منع ہے تو مردوں سے بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ اب لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں۔ اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ممد (مددگار) ومعاون ہوجائیں گے۔ سو یہ اور بھی بے ادبی ہے اس لیے کہ وہ حضرات مقرب ہیں اور جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے جب کہ امور آخرت میں مستغرق بھی ہیں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی نیز عقل کے خلاف بھی تو ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا اور یا دنیوی کاموں میں مدد اور اعانت کی خواہش کرنا کیسے عقل تسلیم کرسکتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیز مانگو جو ان کے پاس ہو۔ تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کرسکتا ہے اور روپیہ اور بیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں پھر وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہیں ہوگا پھر ایسی چیزیں ان سے مانگو جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے۔

رہا یہ خیال کہ وہ دعا کردیں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

عوام کے باطل نظریات

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پیر صاحب کی نیاز دے دو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی بی نیاز تو اللہ میاں کے لیئے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پیر صاحب کو پہنچائے دیتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ تعالیٰ کی نیاز تو میں دلا چکی۔ اس پر بڑے پیر صاحب ہی کی نیاز دے دو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بالاستقلال سمجھتے ہیں۔(۱)

اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تعزیہ میں لٹکانے کو لکھ دو ہم نے کہہ دیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔

ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے تھے کہ میں نے تعزیہ میں ایک پتلا موم کا رکھا دیکھا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ پتلا کیسا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ پتلا اس واسطے رکھا ہے کہ لڑکا اس شکل کا ہو۔

ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکائی اور اولاد کی درخواست کی۔ ایک شخص نے اس عرضی کے نیچے یہ لکھ دیا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے اسے طلاق دے کر دوسری شادی کرو اور یہ شعر لکھ دیا۔

زمین شورہ سنبل بر نیارد درد تخم عمل ضائع مگر داں

یعنی شورزمین میں سنبل نہیں اگتا اس میں تخم عمل ضائع نہ کرو۔

اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ راقم امام حسین۔ عرضی والے نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑے کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے لکھ دیا ہے ممکن ہے کہ انہوں نے ہی لکھ دیا ہو کیونکہ

(۱) مستقل بالذات بااختیار سمجھتے ہیں۔

اگر وہ اس کے پڑھنے پر قادر ہیں تو لکھنے پر بھی ضرور قادر ہوں گے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔ آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے اور یہ ادب اور شریعت اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے۔

غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلاف ادب ہے تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہوں گی۔ ان حضرات کو ایسی باتوں سے نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں پاخانہ پیشاب کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان حضرات کو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔

حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی تو انہوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے (من احب شیئًا اکثر ذکرہ) ''جس شخص کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا ذکر اکثر کرتا ہے''۔

شبہ کا جواب

یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت فرمائی ہے تو کیا معاذ اللہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دنیا کے ساتھ محبت تھی اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لیے مذمت فرمائی ہے کہ جو لوگ اس کو مذموم نہیں سمجھتے یعنی عوام کے لیے وہاں مذمت کرنے کی ضرورت تھی اور جہاں سب زاہد ہوں اور دنیا سے نفرت کرنے والے اور دنیا کو مذموم سمجھنے والے ہوں وہاں اس کی مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس حضور کی مذمت فرمانے پر اس کو قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ یہ حضرات تو خود دنیا کو مذموم سمجھتے ہیں پھر ان سے مذمت کرنے کی کیا ضرورت ہوئی۔ البتہ اگر کسی جلسہ

میں محبّ دنیا(۱) موجود ہوں تو وہاں چونکہ دنیا کی مذمت کی ضرورت ہے لہٰذا مذمت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ پس اس سے معلوم ہوگیا کہ اہل حال کو مذمت کرنے سے اس کا محبّ ہونا کیسے لازم آیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ بلا ضرورت مذمت بھی اس شے کی کی جاتی ہے جس کی کچھ قدر ہو دیکھئے پیشاب پاخانہ کی کوئی مذمت نہیں کرتا۔ پس مذمت کرنے سے ایسی حالت میں مقصود ہوتا ہے کہ ہم ایسے عالی ہمت ہیں کہ دنیا جیسی عزیز چیز کو بھی نگاہ میں نہیں لاتے۔ اس وجہ سے حضرت رابعہ نے فرمایا کہ تم دنیا کو دوست رکھتے ہو۔

غرض یہ کہ علماء کے پاس دنیا کے جھگڑے نہ لے جانے چاہئیں اور اگر کوئی کہے کہ ایک کلمہ سے کسی کا بھلا ہوجائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے تو میں کہوں گا کہ سفارش کرنے والے کا نفع ہوتا ہے مگر اس بے چارہ کا نقصان بھی تو ہوتا ہے جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے کہ اس کو دب کر ماننا پڑتا ہے چاہے اس کے مصالح کے کتنا ہی خلاف ہو تو یہ اچھی نفع رسانی ہوئی کہ اس سے دوسرے کو نقصان پہنچا۔ ایک کا تو ہوا نقصان اور دوسرے کا نفع۔ (حفظت شیئا وغابت عنك اشیئا) ''یعنی ایک کی نفع رسانی ہوئی دوسرے کے بہت سے مصالح فوت ہوگئے''

اس کے نفع کا تو خیال ہوا اور دوسرے کے نفع کا خیال نہ ہوا۔ خلاصہ یہ کہ علماء کو لوگوں کے دنیا کے قصوں میں نہ پڑنا چاہئے یہ بھی اسی اصل کی فرع ہے اور بھی بہت سے اس اصل کے فروع میں مگر جو کچھ بیان ہوگئے کافی ہیں اس لیے اور ضروری نہیں حاصل یہ ہے کہ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے خود غرضی کا شبہ ہو۔

حقوق والدین

اب میں اصل بیان کی طرف آتا ہوں کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے

(۱) دنیا سے محبت کرنے والا۔

اسی ایہام خودغرضی سے بچنے کے لیے حقوق والدین کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے اس کو ذکر فرمایا کہ۔﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ﴾ الآیۃ ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور حقوق والدین کے بعد فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت علی الاطلاق(۱) نہیں بلکہ اسی وقت تک ہے جب تک خدا کے خلاف نہ کہیں اور اگر وہ خدا کے خلاف کوئی بات کہیں تو نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرو۔ یہ تو رابطہ کے لیے بیان کیا گیا۔ اب آگے وہ جملہ ہے جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ﴿ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ (یعنی ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہ میری طرف سے ہٹاتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو گو ماں باپ ہی ہوں۔ بلکہ ان کی اطاعت کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے اور اس کے مابعد میں وعید فرمائی ہے کہ چونکہ میرے پاس تم سب کو آنا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا اتباع کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے ورنہ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر ہم تم کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کام کئے۔ یہ مقام کا حاصل ہوا اختصار کے ساتھ۔

پس اس جملہ کا مطلب تو معلوم ہو گیا۔ اب مجھ کو اس سے ایک مسئلہ کا ذکر کرنا ہے جو بہت ہی معرکۃ الآرا(۲) مسئلہ ہے اور ہر چند کہ مسلمان کے لیے وہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا مگر ہماری ناحقیقت شناسی کی وجہ سے وہ معرکۃ الآرا ہو گیا وہ مسئلہ ہے اتباع کا۔

اتباع کا معنی

اتباع کے معنی تو سب کو معلوم ہیں لیکن اس کے محل میں اختلاف ہو گیا کہ اتباع کے قابل کون ہے۔ یہ مسئلہ مسلمان کے لیے تو معرکۃ الآرا اس لیے نہ ہونا چاہیے

(۱) ہر بات میں اطاعت کا حکم نہیں ہے (۲) بہت بڑا مسئلہ ہے۔

تھا کہ مسلمان من حیث المسلمان (اس حیثیت سے کہ وہ مسلمان ہے) کو خدا کے حکم کی اطاعت کرنی چاہئے کیونکہ مسلمان رعیت خدا کی ہے اور جس کی رعیت ہیں اسی کے حکم کی اطاعت بھی کرنی چاہیے۔

یہ مثال میں اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ آج کل کوئی بات بدوں نظیر کے نہیں مانی جاتی سو اس نظیر میں غور کیجئے تا کہ اس سے یہ سمجھ میں آجائے کہ مسلمان ہونے کا مقتضا یہی ہے کہ خدا کی اطاعت ہو۔ کیونکہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں بادشاہ کی رعیت ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہی کہ اس شخص کے لیے اس بادشاہ کا قانون واجب الانقیاد (فرمانبرداری) ہے گو وہ اس کی سمجھ میں نہ آئے اگر کوئی شخص باوجود رعیت ہونے کے اپنے بادشاہ کے کسی قانون کو نہ مانے تو سب لوگ اس کو ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ تو رعیت ہو کر ایسا کام کر رہا ہے جو رعیت ہونے کی شان کے خلاف ہے۔ تیری سمجھ میں نہ آئے، مگر چونکہ اپنے بادشاہ کا قانون ہے اس لیے ماننا چاہئے اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے اول یہ معلوم ہو جائے کہ اس قانون میں فائدہ اور مصلحت کیا ہے تب عمل کروں گا۔ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ کہنا بغاوت ہے بس اب آپ ہی بتلائیے کہ اس شخص کو جو رائے دی جاتی ہے یہ کیسی رائے ہے ظاہر ہے کہ بالکل صحیح اور درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ وہ شخص رعیت ہے اور رعیت ہونے کا مقتضا ہی یہ ہے کہ اپنے بادشاہ کا مطیع ہو۔

بس اب سمجھو کہ مسلمان ہیں خدا کی رعیت، تو ان کو خدا کا مطیع ہونا ضروری اور خدا کے ہر قانون پر عمل کرنا اور اس کا ماننا فرض ہے گو کوئی قانون سمجھ میں بھی نہ آئے جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ رعیت کو بادشاہ کا ہر قانون ماننا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کسی انسان کی رعیت ہونے کا تو یہ اثر ہو کہ اس کے ہر قانون کو ماننا چاہئے اور

اس پر عمل کرنا ضروری ہو اگرچہ سمجھ میں نہ آئے اور اس میں حجت کرنا بغاوت میں داخل ہو اور خدا کی رعیت ہونے کا یہ اثر نہ ہو بلکہ اس کے حکم میں کھنڈت (۱) ڈالتے پھریں اور اس کو بغاوت نہ سمجھیں۔

علماء پر اتہام

ہاں اگر کوئی شخص کہے کہ ہم خدا کے حکم میں کھنڈت نہیں ڈالتے بلکہ ہم کو یہی شبہ ہے کہ یہ حکم خدا اور رسول کا ہے بھی یا نہیں چنانچہ اس وقت بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو علماء نے گھڑ لیا ہے۔ خدا اور رسول کا یہ مطلب نہ تھا بلکہ یہ تھا جس زمانہ میں جیسی ضرورت ہو ویسا کرلو۔

مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک شخص نے لکھا ہے کہ قرآن شریف میں یہ خوبی ہے کہ وہ سب تحقیقات پر منطبق ہوجاتا ہے۔ اپنے نزدیک تو اس شخص نے قرآن شریف کی بڑی مدح کی مگر واقع میں یہ مذمت ہوگئی کیونکہ ان کے قول پر ان کی ایسی مثال ہوگئی جیسے ایک نجومی کا قول تھا کہ لڑکا نہ لڑکی۔ وہ ایک پرچہ پر لکھ کر دے جاتا تھا۔ اگر لڑکا ہوگیا تو یہ کہتا کہ میں نے جو لکھا تھا وہی ہوا کہ لڑکا۔ نہ لڑکی۔ یعنی لڑکا ہونے کی صورت میں وہ (نہ) کو لڑکی کے ساتھ ملاتا اور اگر لڑکی ہوگئی تو بھی کہتا کہ میرے قول کے موافق ہے کیونکہ میں نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ لڑکا نہ۔ لڑکی یعنی لڑکا نہیں ہوگا بلکہ لڑکی ہوگی۔ یعنی اس صورت میں نہ کو ماقبل کے ساتھ ملاتا اور جو کچھ نہ ہوتا تو کہہ دیتا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ لڑکا نہ لڑکی یعنی نہ یہ نہ وہ۔ غرض اس کا انعام ہر طرح زندہ رہتا تھا پس اسی طرح ہمارے بھائی مسلمان چاہتے ہیں کہ معاذ اللہ قرآن مجید کی یہ گت بنائیں کہ جیسی ضرورت ہو اسی پر اس کے الفاظ کو چپکا دیں۔

(۱) اس کے احکام میں خرابی ڈالنے کی کوشش کریں۔

تو آج کل جو اس مشرب کے لوگ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کا تو یہ مطلب ہے نہیں بلکہ یہ مولویوں نے گھڑ لیا ہے۔ پس ہمارا اعتراض مولویوں پر ہے نہ کہ قرآن وحدیث پر اور حدیث سے تو ان لوگوں نے انکار کیا ہی تھا کہ بھلا ایسی لمبی حدیثیں لوگوں کو سن کر یاد کیسے ہوگئیں جس کا جواب بحمداللہ رسالوں میں کافی موجود ہے مگر اب قرآن شریف پر بھی ہاتھ صاف کیا کہ ایسی ایسی تاویلیں اور کھینچ تان کرنے لگے کہ جیسی ضرورت ہو اس پر چپک جاوے۔

اخبار بینی

میں نے اخباروں میں ایسے مضامین بہت دیکھے۔ اب اخباروں میں مذہبی احکام کے متعلق بھی رائے شائع کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اخبار کے متعلق لکھ دیا تھا کہ ان کو دیکھنا جائز نہیں۔ اس پر اعتراض کیے جانے لگے کہ لو اخبار بھی حرام ہوگئے کہ نہیں دیکھنا چاہئے تو سمجھو کہ میں نے اخبار دیکھنے کو منع نہیں کیا۔ مگر ایک تو ہے خبر اور ایک ہے رائے اور اخبار ہے خبر کی جمع۔ سو خبروں کا دیکھنا تو جائز ہے۔ لیکن وہ ایڈیٹروں کی رائے اور تحقیقات جو دین کے متعلق ہوں نہ دیکھنا چاہے تو میں نے اصل میں اخبار دیکھنے کو منع نہیں کیا بلکہ انشات یعنی ایڈیٹروں کی رائے اور تحقیقات کو دیکھنے سے منع کرتا ہوں۔ وہ بھی جب کہ دین کے متعلق ہوں اور وہ بھی اس لیے نہیں کہ دین میں رائے کو دخل ہی نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ رائے فاسد ہوتی ہیں۔

ملاحظہ کیجئے کہ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ربا احرام ہونے کی دلیل قرآن مجید میں نہیں۔ دیکھئے تو کیسے غضب کی بات ہے کہ جس کے بارے میں نص صریح موجود ہے اس کا انکار کرتے ہیں اور جب کوئی انہیں جواب دیتا ہے کہ ربا کا لفظ تو

قرآن مجید میں مصرح ہے(۱) اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے) تو کہتے ہیں کہ اس ربا سے یہ ربا مراد نہیں بلکہ وہ ربا ہے بضم را (را کے پیش کے ساتھ) ربودن سے، اس سے غضب مراد ہے۔ کیا خوب! قرآن میں فارسی گھس گئی۔

تو یہ ایسا ہوا جیسا کہ ایک جولاہے نے ماں کو دینا بند کر دیا تھا ایک ملا جی نے اس سے کہا کہ تو ماں کے حقوق کیوں نہیں ادا کرتا۔ تو اس نے کہا کہ قرآن میں بیوی کے کھانے کھلانے کا حکم ہے اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ (جوی بعض دیہات میں بیوی کو کہتے ہیں) اور ماں کے لیے کہیں یہ حکم نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ بیوی کے لیے تو کھانا ہی کھلانے کو کہا اور ماں کے لیے تو یہ حکم کیا ہے کہ ماں کا سب (ما کسب) مگر وہ بے وقوف تھا ورنہ کہتا کہ لایلاف، تبت یدا سے پیچھے یعنی سیپارہ میں تو وہ ناسخ ہے۔ غرض جیسا کہ اس نے من جوع کا من جوی کہا تھا انہوں نے ''ما کسب'' کو ماں کا سب بنا دیا۔

اسی طرح آج کل کہتے ہیں کہ ربا کی ممانعت قرآن میں نہیں ہے اب کسی نے کہا کہ ظالم ربا تو قرآن میں موجود ہے تو کیا کہتے ہیں کہ ہاں ہے تو مگر وہ ربا نہیں ہے بلکہ رُبا ہے کیونکہ اعراب تو مولویوں نے لگائے ہیں کیا ٹھکانہ ہے جہل کا۔

خودرائی

ایک شخص نے راندیر سے خط لکھا کہ ایک شخص بہت دور تک ڈگریاں حاصل کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے تیمّم کیا تو جیسے وضو میں کلی کیا کرتے ہیں اس طرح منہ میں مٹی بھر لی۔ غرض خاکش بدہن (اس کے منہ میں خاک) کا مضمون

(۱) صاف موجود ہے۔

خوب صادق آیا۔ حضرات ان معترضین کے علم کی یہ حالت ہورہی ہے پس جس کی معلومات کی یہ حالت ہو اور وہ کرے اجتہاد خیال کیجئے کتنے غضب کی بات ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اخباروں کے اندر جو اس قسم کے مضمون ہوں وہ نہ دیکھیں اور غضب یہ ہے کہ مسلمان تو قرآن وحدیث میں اجتہاد کرتے تھے اب کفار بھی کرنے لگے۔

چنانچہ ایک انگریز صاحب نے کہا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعون اڑ کر لگتا ہے کیونکہ قرآن میں حکم ہے کہ جہاں طاعون پھیلے وہاں کے آدمی دوسری جگہ نہ جائیں۔ تو یہ دوسری جگہ جانے کی ممانعت کس لیے کی، اس لیے کہ یہ لوگ دوسری جگہ جائیں تو ان سے وہاں کے لوگوں کو لگ جائے گا۔ تو ایک تو یہ غضب کہ ممانعت تو کی گئی ہے حدیث میں، اور آپ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ممانعت کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ ممانعت کی وجہ اپنی طرف سے تراشتے ہیں(۱)۔ گویا کوئی اور وجہ ہو نہیں سکتی تو گویا قرآن وحدیث ایسی چیز ہوگئی کہ غیر مسلم بھی اس میں اجتہاد کرنے لگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اب فاسد رائیں(۲) شائع کی جاتی ہیں اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ ایسے رسالے اور ایسے مضامین ہی نہ دیکھیں۔ خیر اخبار کا ذکر تو طبعًا آ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کا یہ مطلب ہی نہیں جو علماء بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے وہی معنی صحیح جو کہ ہم نے سمجھے۔

قانون کے صحیح مفسر

تو اس شبہ کے اٹھانے کے لیے میں دوسری نظیر(۳) دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کہ پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے وہ معنی ہیں جو کہ جج سمجھتے ہیں

(۱) خود گھڑتے ہیں (۲) غلط آرا (۳) مثال۔

کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط وکتابت ہی نہیں۔ جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے۔ پس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اس کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں دیکھئے جب ایک ہائیکورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپ کا یہ کہنا قابل سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے۔ ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ گلخپ ہو(۱) اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کے مخالف قرار دیا جائے گا اور اس کے لیے سزائے جیل تجویز کی جائے گی۔ اگر اس وقت آپ یہ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھتے قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں۔ تو کیا آپ کا یہ عذر قابل سماعت ہوگا۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ جواب ملے گا کہ تم اپیل کرو۔ دیکھئے کہ ہائیکورٹ کے جج قانون کے سمجھنے والے تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ اور وہ جو قانون کے معنی بیان کریں۔ اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے کیونکہ پارلیمنٹ کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو نہیں کرتے بلکہ وہ اصول کلیہ بنادیتے ہیں۔ اس لیے قانون کے سمجھنے والے ہائیکورٹ کے جج قرار دیئے گئے ہیں۔ تو ہر چند کہ ہائیکورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کے خلاف نہیں کرتا بلکہ جو یہ اس قانون کے معنی بیان کرتے ہیں اس کے خلاف کرتا ہوں مگر اس کا یہ عذر نہیں سنا جائے گا اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

ائمہ مجتہدین کی شان

بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن وحدیث کے سمجھنے والے مان لیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کی مخالفت خدا اور رسول کی مخالفت ہے کہ حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہوسکتا۔

(۱) عدالت کے ساتھ الجھے کہ اس کے وہ معنی نہیں جو عدالت نے بیان کئے۔

شاہد نیست کہ موے ومیانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ کمر پتلی ہو محبوبیت اس کی آن اور اولاد میں ہوتی ہے جو محبوب اور دلکش ہوتی ہے۔

مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ تعالیٰ سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی۔ تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں۔ خدا تعالیٰ سے پوچھئے لیکن پھر کل کو یہ بھی پوچھنا کہ انبیاء کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی۔ ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دی پیغمبری میری بار کیوں دیر اتنی کر دی۔ اول نظم سے آخیر تک خدا کی شکایت ہے تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ

آنکس کہ تونگرت نمے گرداند او مصلحت تو از تو بہتر داند(۱)

غرض یہ کہ خدا نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جزئیات استنباط کرو جن کا حکم فقہاء کے کلام میں نہ دیکھا ہو۔ پھر اول معاملات میں فقہاء کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو ان کے استنباط کے ساتھ موازنہ کرو تب معلوم ہوگا کہ فقہاء اور مجتہدین کی کیا شان ہے۔ مگر اس کے لیے بھی ضرورت ہے علم کی۔ ایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ ہوسکتا ہے کہ ہم میں اور ائمہ مجتہدین میں کتنا فرق ہے۔

علماء اور عوام میں فرق

پس اس تفاوت کی وجہ سے عوام کو تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت، اور علماء کی مثال ایسی ہے جیسے وکلا اور ائمہ مجتہدین جیسے ہائی کورٹ کے جج پس ایک رعیت

(۱) ''یعنی خدا تعالیٰ جو تم کو تونگر نہیں بناتے وہ تمہاری مصلحتوں کو تم سے بہتر جانتے ہیں''۔

کو ہائیکورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ غلطی ہوجاتی ہے مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ علماء ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعارض (۱) موجود ہے عامی (۲) کے ذمہ واجب ہے کہ اس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں۔ خدا اور رسول کی مخالفت نہیں کرتا پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں۔ حتی کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لیے بھی علم کی ضرورت ہے جیسے کہ قانون کا ترجمہ ہوگیا ہے مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے پیش نہیں کرسکتا خواہ وہ کسی کتاب کے پیش کرنے کے ساتھ ہو اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا جو قانون کا ترجمہ نہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالف قرار دیا جائے گا۔ تو اسی طرح اگرچہ حدیث کا ترجمہ ہوگیا ہے مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے مزاحمت کرنا جائز نہیں اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنے والا واقع میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنے والا ہے۔ اسی طرح علماء کی مخالفت کرکے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے نہایت نازیبا اور لچر عذر ہے (۳)۔

اتباع علماء کی ضرورت

بحمداللہ یہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہوگیا اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ کو علم

(۱) ایک دیندار عالم کا فتویٰ جس میں کوئی اختلاف نہیں (۲) عام آدمی (۳) گھٹیا عذر ہے۔

دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے کیونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم وبیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی کا تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں۔ مگر باوجود اس کے کتنا ہی بڑا کوئی شخص ہو مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر مسہل (۱) نہ لے گا اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صفراء کا فساد ہے (۲) جب بھی اپنی رائے سے علاج نہیں کرے گا۔ کیا کسی نے ایسا کیا ہے ہرگز نہیں اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر کوئی یہ رائے دے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے تو کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہئے اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔

پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے تو گویا شریعت میں کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی پامال اور معمولی شے ہے کہ اس کے لیے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہوگا مگر بدوں اتباع (۳) طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے۔

پس عقلی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتاتے ہیں وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں۔ پس جب یہ خدا ورسول کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہئے کیونکہ مسلمان کو مسلمان

(۱) دست آور دواء (۲) اخلاط اربعہ میں سے ایک زرد رنگ کا کڑا خلط اس میں گڑبڑ ہے (۳) حکیم کی بات تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اتباع میں اختلاف نہ ہوتا مگر ہماری نادانی دیکھئے کہ اس میں بھی اختلاف کیا اور ایسا کام کیا جیسا کہ ایک طالب علم نے کیا تھا کہ دستار فضیلت ان کے بندھ گئی تھی مگر ان کو آتا جاتا خاک نہ تھا(۱)۔

آج کل طلباء کا حال

آج کل یہ بھی ایک مرض ہوگیا ہے کہ لوگ کتابوں کے ختم کرنے کو اصل سمجھتے ہیں اگرچہ سماعت ہی سے ہو اور کتاب کی عبارت ایک دن بھی نہ پڑھنا پڑے اور اب تو بعضوں کی یہ حالت سنی ہے کہ سبق میں شریک بھی ہیں مگر اس کی خبر نہیں کہ سبق کہاں ہو رہا ہے اور کس مسئلہ کی تقریر ہو رہی ہے۔

لکھنؤ کا عجیب واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ صدرا(۲) کا سبق ہو رہا تھا اور ایک طالب علم جو اس میں شریک تھے بجائے صدرا کے شمس بازغہ(۳) لے کر آئے تھے۔ اتفاق سے ایک مقام پر مدرس کو شبہ ہوا تو انہوں نے ہر طالب علم سے دریافت کرنا شروع کیا کہ تمہاری کتاب میں کیا عبارت ہے ان حضرات سے جو دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ ابھی میری نظر سے وہ عبارت چوک گئی ہے دیکھ کر بتلاتا ہوں۔ آخر جب انہیں دیکھنے میں بہت دیر ہوئی تو ان مدرس صاحب نے کتاب ان کے سامنے سے اٹھالی تاکہ خود دیکھ لیں مگر دیکھا تو شمس بازغہ ہے۔ تب انہوں نے کہا کہ کیا تم روز مرہ یہی کتاب لاتے ہو اس نے کہا جی ہاں! میں تو روز مرہ یہی کتاب لاتا ہوں۔

تو جیسے یہ طالب علم تھے وہ بھی ایسے ہی تھے ان کی کتابیں ختم ہوگئی تھیں اور دستار فضیلت بندھ گئی۔ جب چلے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے آپ نے پگڑی

(۱) ان کے پاس علم کچھ نہیں تھا (۲۔۳) کتاب کا نام۔

تو باندھ دی مگر مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔ اگر کوئی مجھ سے کچھ پوچھ بیٹھے تو میں کیا جواب دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسی بات بتلاتا ہوں کہ ہر سوال کا جواب ہوجائے۔ جب کوئی شخص تم سے کچھ پوچھے اور اس کا جواب تمہیں معلوم نہیں ہو تو کہہ دیا کرنا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کیونکہ قریب قریب ہر مسئلہ میں کسی نہ کسی عالم کا اختلاف ہے ہی۔ آخر انہوں نے ایسا ہی کرنا شروع کردیا۔ لوگ سمجھتے کہ بڑا ہی وسیع النظر عالم ہے کہ تمام علماء کے اقوال اس کے پیش نظر ہیں پس لوگوں میں اس کی دھاک بندھی ایک شخص اس معاملہ کو سمجھ گئے۔ انہوں نے پوچھا کہ لا الٰہ الا اللہ کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ انہیں تو ایک ہی جواب یاد تھا۔ کہنے لگے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے تب لوگوں پر ان کی اصلیت ظاہر ہوئی۔

ہم نے اس طالب علم جیسی حالت بنا رکھی ہے کہ ہر چیز میں اختلاف جو چیز اختلاف کی نہ تھی اس میں بھی اختلاف بنایا۔ لو یہ بھی کوئی اختلاف کی بات تھی کہ خدا اور رسول کا کہنا ماننا ضروری ہے مگر اس میں بھی مسلمانوں میں اختلاف ہوا اور کیا یہ ایسا مضمون ہے کہ اس کے سمجھانے کے لیے کوئی جلسہ کیا جائے مسلمانوں کے کان میں تو علماء کا یہ قول پہنچ جانا کافی ہونا چاہئے تھا کہ یہ خدا کا حکم ہے جیسا کہ صاحب جج کا کہنا کہ یہ حکم گورنمنٹ کے قانون کے موافق ہے کافی ہوتا ہے سو اس میں کوئی خفا نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس ظاہر بات میں بھی مسلمانوں کا اتفاق نہ ہوسکا تو یہ ایک جدید مرض مسلمانوں میں پیدا ہوا کہ انہوں نے خدا کے حکم میں اختلاف کرنا شروع کیا مگر چونکہ اب اس مرض میں ابتلا ہوگیا ہے اس لیے اس کا علاج بیان کرنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است اگر خاموش بنشینم گناہ است

یعنی اگر یہ دیکھو کہ اندھا ہے اور اس کے راستہ میں کنواں ہے اس حالت میں اگر خاموشی اختیار کروں تو گناہ ہے۔

جدید مرض

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ مرض جدید ہے اس لیے اس مرض کا علاج بھی جدید ہوگا۔ مگر قربان جائیے کہ ہر مرض کا علاج قرآن حدیث میں موجود ہے۔ بعض مرتبہ طبیب بھی کہہ دیتے ہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرض ہے۔ چنانچہ میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ اس کے حلق سے لقمہ پسلی میں جاتا تھا۔ بہت سے طبیبوں کو دکھلایا مگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی کیا وجہ ہے یہ کمال طب روحانی میں ہے کہ کسی مریض کو جواب نہیں دیا جاتا۔ وہاں تو طبیب سے جواب بھی مل جاتا ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے یا یہ کہ اس مرض کا طب کی کتابوں میں ذکر نہیں اور طب روحانی میں یہ کہیں نہیں۔ چنانچہ سب سے بڑھ کر مرض کفر اور شرک کا ہے اس کا علاج بھی مذکور ہے کہ اگر سو مرتبہ بھی ہو تو پھر یہ ارشاد ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾(۱)

یہ آیت ایسوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسی

(۱) ''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر وشرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا۔ تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے'' سورۃ الزمر: ۵۳۔

طرح اس مرض کا بھی علاج قرآن مجید میں موجود ہے۔ گو مسلمانوں کا یہ اختلاف ایک مرض جدید تھا۔ اس عنوان سے تو جدید نہیں کہ خدا اور رسول کا کہنا نہیں مانتے مگر اس عنوان سے جدید ہے کہ ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے۔ یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی۔ تو اتنا جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ ﴿ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ﴾ (ان کے راستے کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین الله (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرمادیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے۔ اس لیے فرمایا کہ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ تو یہ کتنا عجیب وغریب قصہ ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے۔

یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ بہت سے عقلاء جو یہ رائے دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت ہے کہ علم کلام جدید تیار ہو۔ علم کلام قدیم آج کل کے لیے کافی نہیں ہے بالکل غلط رائے ہے۔ دیکھئے یہ کتنا جدید مرض تھا مگر پھر بھی قرآن مجید میں اس کا علاج مذکور ہے اسی طرح ہر شبہ کے جواب کے لیے قرآن وحدیث ہی کافی ہے۔

حکیمانہ جواب

میں ایک جگہ گیا تو ایک معزز عہدہ دار خیر خواہ قوم نے کہا کہ علماء کو چاہئے کہ علم کلام جدید تیار کریں۔ میں نے کہا کہ بہتر ہے کلام جدید تیار ہو جائے گا مگر اس کی صورت یہ ہے کہ دس انگریزی یافتہ نوکر رکھئے اور انگریزی کتابیں جمع کیجئے

جن میں اسلام پر اعتراض کیے گئے ہیں۔ وہ انگریزی تعلیم یافتہ ان کا اردو میں ترجمہ کریں اس طرح سائنس کا بھی ترجمہ ہوجائے گا اور پھر جب ترجمہ ہوجائے تو ان کو موقوف کردیجئے اور ان کی بجائے علماء کو منتخب کرکے رکھیے۔ وہ ان اعتراضات کے جواب لکھیں جیسے اس کے قبل بادشاہوں نے کیا ہے پھر جب ان اعتراضات کے جوابات مکمل ہوجائیں تو ان کے بجائے پھر انگریزی تعلیم یافتہ رکھے جائیں وہ ان کا انگریزی میں ترجمہ کردیں۔ تو ایک زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہے اور اس کے اخراجات کے لیے عام چندہ نہ کیجئے بلکہ رؤسا میں سے ایک سو آدمی مقرر کیجئے اور پچیس پچیس روپے ماہوار سب سے لیجئے تو بہت آسانی سے علم کلام جدید تیار ہوسکتا ہے۔ بس یہ سنتے ہی خشک ہوگئے وہ تو علماء پر مشق کرتے ہیں میں نے کہا کہ میں ان کا آسان علاج کروں کہ ہمیشہ کے لیے یہ سیدھے ہو جائیں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ جب کبھی ملے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔

سو علماء پر مشق ہونے کی وجہ یہی ہے کہ چاہتے ہیں کہ چندہ بھی یہی جمع کریں اور کام بھی یہی کریں۔ ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے اور جب ایسی صورت تجویز کی جاتی ہے جس میں انہیں بھی کام کرنا پڑے تو پھر چپ ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔

دینی نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت نہیں

حاصل یہ کہ جس کو میں نے علم کلام جدید کہا ہے وہ محض عنوان کے اعتبار سے جدید ہے معنوں کے اعتبار سے جدید نہیں کیونکہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جو کلام قدیم میں نہ ہو لیکن آج ہمارے اکثر عقلاء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کافی نہیں اس طرح فقہ بھی کافی نہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے جو ماہر ہوگا وہ سمجھے گا کہ کوئی شبہ ایسا نہیں نکلتا جس کے لیے علم کلام قدیم میں اصول نہ ہو۔ مگر مہارت کی ضرورت ہے ہاں اس

معنی کے لحاظ سے اس کو جدید کہہ دو کہ اس کا عنوان نیا ہوگا۔ یہی حال فقہ کا ہے۔

مجھے ایک فقہ کا مسئلہ یاد آ گیا کہ مجھ سے ایک مرتبہ یہ سوال کیا گیا کہ جو گراموفوں ہے اس میں قرآن بھی بھرا ہوا ہوتا ہے اور اس میں اس کے نقوش ہوتے ہیں۔ تو اس ریکارڈ کو جس میں قرآن بھرا ہوا ہو بلا وضو ہاتھ لگانا جائز ہے یا نہیں۔ میں نے اس کا ایک جواب دیا۔ ممکن ہے کہ کسی کو اس سے بہتر جواب آتا ہو۔ مگر میں نے یہ جواب لکھا کہ یہ دیکھا جاوے کہ ان نقوش کی ان حروف پر دلالت ہے یا نہیں۔ مثلاً ایک ریکارڈ میں قرآن ہے اور ایک ریکارڈ میں اور کوئی مضمون ہے تو کیا ان میں ایسا امتیاز ہے کہ صرف ان نقوش کو دیکھ کر شناخت ہوجاوے کہ یہ قرآن ہے اور یہ فلاں مضمون ہے۔ اگر اس میں امتیاز ہے کہ اس کو دیکھ کر یہ شناخت مضمون کی ہوجاتی ہے تو وہ ایسا ہے جیسا کہ حافظ کے دماغ میں قرآن مرتسم (چھپا ہوا) ہوتا ہے اس کا بلا وضو چھونا جائز ہے۔

غرض کہ جو کلام اور فقہ قدیم کو اچھی طرح پڑھے ہوئے ہوگا اور اس کو اس میں مہارت ہوجاوے گی تو میں تو ذمہ داری کرتا ہوں کہ وہ اسی پرانے فقہ اور پرانے علم کلام سے ہر سوال کا جواب دے گا۔ تو نہ فقہ جدید کی ضرورت ہے نہ کلام جدید کی مگر چونکہ ہر شخص کا ایسا فہم نہیں ہے اس لیے اگر آج کل کے شبہات کے جدید عنوان سے جواب ہوجاویں تو مضائقہ نہیں ہے۔ مجھے اس وقت یاد آیا کہ ایک کتاب ہے میری ''الانتباهات المفيده'' اس میں شبہات جدیدہ کا خوب حل کیا گیا ہے غرض یہ کہ قرآن مجید ایسی کافی کتاب ہے کہ اس میں جدید مرضوں کا علاج ہے۔

اتباع میں غلو

ایک یہ بھی نیا مرض تھا جس کی نسبت کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے کہ حکم الٰہی

کے اتباع میں اختلاف کرنے لگے اور پھر اس میں کئی طبقے ہورہے ہیں جن میں سے ایک تو وہ کہ ان کے نزدیک اتباع ہی کی ضرورت نہیں جیسا کہ میں نے ان کی حالت پہلے بیان کی کہ جو خود ان کی سمجھ میں آتا ہے وہ کرتے ہیں۔ اتباع علماء ہی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتے۔ سو ایسے لوگ ہیں تو بہت کم، مگر ان کا اثر بہت ہے کیونکہ اکثر معزز لوگ ہی اس جماعت میں ہیں۔ ان کے اثر سے اندیشہ ہے بہت لوگوں کی تباہی کا۔ اس لیے ان کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے اور ایک وہ لوگ ہیں کہ وہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں مگر اس کا کوئی معیار نہیں ہے بلکہ وہ حالت ہے کہ

لختے برد از دل گزرد ہر کہ زپیشم من قاش فروش دل صد پارہ خویشم (۱)

جو سامنے آ گیا اس کے معتقد ہو گئے خلاصہ یہ ہے کہ ان کو اتباع میں اس قدر غلو ہے کہ ہر ایک کے اتباع کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں کوئی مردہ خواب میں کہہ دے کہ فلاں فلاں کام کرنا یا کسی کے اوپر بھوت آ جائے اور وہ کہے کہ چورا ہے پر مٹھائی رکھ آنا غرض کوئی ہو۔ انہیں سب کی مان لینا۔ ان کے ہاں روز ایک معبود تراشا جاتا ہے آج اس کا اتباع کر رہے ہیں کل کو دوسرے کا۔ مگر یہ اتباع کون سا ہے۔ یہ زیادہ تر اعتقادی ہے اور عملی کم ہے عملی اتباع صرف اسی کا کرتے ہیں جو نفس کے موافق ہو۔ غرض یہ لوگ بزرگوں کے بھی معتقد ہو گئے اور مجذوبوں کے بھی اور سالکوں کے بھی اور ہر شخص کی خدمت بھی کرنے لگے اور گو کہنا سب کا کرتے نہیں مگر اعتقاد سب کا ہے تو ایک جماعت میں تو اتباع ایسا سستا ہے اور ایک میں اتباع بالکل ہی نہیں پس اس میں دو قسم کے لوگ ہو گئے ایک تو سب کے متبع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی متبع نہیں۔ پس ایک جماعت میں

(۱) ''جو شخص میرے سامنے سے گزرے دل کا ایک ٹکڑا لے جائے اس لیے کہ میں اپنے صد پارہ دل کا قاش فروش ہوں''۔

تفریط ہے اور ایک میں افراط ہے(۱)۔ حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں کہ ﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾ (یعنی جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو)

اتبع سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس وناکس کے معتقد ہو جانے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا معیار بتلا دیا اور معیار سے مراد ہے صحیح معیار۔

بزرگی کے معیار

ورنہ یوں تو آج کل معیار بہت ہیں جیسے کشف کہ بعض نے اس کو اتباع کا معیار بنایا اور ہر صاحب کشف کو بزرگ قابل اتباع سمجھا بعض نے معیار بنایا کرامت کو بعض نے وجد وسماع کو بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر زیادہ ہو اور بہت روتا ہو وہ بزرگ ہے۔ بعض نے معیار بنایا تصرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدہوش کر دیا تو سمجھے کہ یہ بڑا بزرگ ہے اور بعض نے معیار بنایا تجرد کو۔ گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر یہ معیار تو نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو(۲)۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے، وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں یہ ان کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ میرے ہاں ایک عورت کو جنون ہوا تو اس کو کشف ہوتا تھا۔ مگر جب

(۱) ایک جماعت کمی کا شکار ہے دوسری زیادتی کا (۲) سخت مزاجی۔

مسہل دیا گیا(۱) تو اس کے ساتھ ہی کشف بھی ختم ہوگیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مالیخولیا(۲) کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگ ایسوں کے معتقد ہوتے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ فلاں بزرگ آکر گالیاں نہ دیں تو کام نہیں ہوتا انہیں خود تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں گالیاں دیں۔ جیسا ہمارے ہاں ایک عورت نے جس کے اولاد نہ جیتی تھی نذر مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا ہو اور وہ لڑکا ماں کی گالی کھا کر آئے تو پانچ روپے کی شرینی تقسیم کروں تو جیسے وہ احمق لڑکے کی گالی کھانے سے خوش ہوتی تھی ایسے ہی یہ مرد بھی گالیاں کھا کر خوش ہوتے ہیں اور ایک حضرت وہ ہیں کہ گالیاں دے کر بھی حضرت رہے۔ میں نے بعض لوگوں کو خود یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ فلاں مجذوب جب سے نرم ہوگئے ہیں کام ہی نہیں ہوتے۔ غرض بزرگی کے معیار عجیب وغریب قائم کر رکھے ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی ہے کیا چیز؟ اس فن کو جانتے ہی نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا ہے کہ اکثر دوسروں کے معتقد ہوجاتے ہیں۔ اور بعضوں کے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ اکھڑ باتیں بکیں۔

ہمارے ہاں ایک شخص تھا اس سے اکثر سٹے والے پوچھنے جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑ بڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے کچھ اصطلاح مقرر کر رکھی تھی۔ اس اصطلاح کے موافق اس کی بکواس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے۔

یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا کوئی شخص صوفی بن جائے پھر اس کی ہر

(۱) دست آور دوا دی گئی (۲) پاگل پن کے مرض میں۔

بات بزرگی ہوجاتی ہے۔ خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلائیں گے اور گالیاں دیں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلائیں۔ ایک دفعہ بزرگی کی رجسٹری ہوجانی چاہئے پھر وہ ایسی پختہ ہوجاتی ہے جیسے بی بی تمیزہ کا وضوء۔

مشہور ہے کہ بی بی تمیزہ نامی ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضوکراکے نماز پڑھوائی اور تاکید کردی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ایک مدت کے بعد وہ پھران کو کہیں ملی تو انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا کہ جی ہاں پڑھا کرتی ہوں انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وضواس روز آپ نے کرانہیں دیا تھا۔

جیسا اس کا وضوایسا پکا تھا کہ بدکاری سے ٹوٹا نہ پیشاب پاخانہ سے آج کل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل ہی نہیں آتا حتی کہ اگر نماز بھی نہ پڑھے تب بھی بزرگ ہیں۔ ایک شخص نے اپنے پیر کی نسبت کہا تھا جو کہ نماز نہیں پڑھتے تھے کہ وہ مکہ میں جاکر نماز پڑھا کرتے ہیں۔

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہوگیا پھر خلل نہیں پڑتا(۱)۔ ہاں ایک صورت میں خلل پرتا کہ شریعت کی بات بتلانے لگے۔ اگر ایسا کرے تو کہتے ہیں کہ میاں یہ تو نراملا ہے اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں کہ اس کو کوئی معصیت (۲) گندہ نہیں کرسکتی یہ تو سمندر ہے سمندر میں چاہے کتنی ہی نجاست پڑجائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کرسکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی وہ پاک ہوگا یہ حضرات تو سر سے پیر تک گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک پیر صاحب اپنی مریدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سنتے سنتے آپ کو

(۱) پھر ٹوٹتا نہیں (۲) گناہ۔

مستی سوار ہوئی اور تخلیہ میں لے جا کر اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہاں سے باہر آ کر فرماتے کیا ہیں کہ جب آ گیا جوش نہ رہا ہوش۔ مگر مریدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے۔ سبحان اللہ! کیا اچھی بزرگی ہے کہ چاہے کیسا ہی کام کرلیں مگر پھر بزرگ کے بزرگ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے وہ درگت بنائی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اول اتباع کی شکایت تھی پھر جب اتباع ہوا تو ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں سو وہ قصہ ہوا کہ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

علماء کی کوتاہی

آج کل زیادہ لوگ دوسری ہی قسم کے پائے جاتے ہیں اور اول قسم کے لوگ کم ہیں مگر ان کا زیادہ اثر ہے سو واقع میں ان کا علاج حق تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اتباع ضروری ہے اور اتباع سے کیسے چارہ ہوسکتا ہے (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کوئی عاقل نہیں کہ کفار بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاقل ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ میں ایک لطیفہ کہا کرتا ہوں کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کے قائل ہیں کیونکہ یہ تو سب کو مسلم ہے (۲) کہ دین اسلام کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ مگر اس کے سبب میں اختلاف ہے کفار تو اس کا سبب حضور کی قوت کو مانتے ہیں اور مسلمان اس کا سبب حق تعالیٰ کی نصرت (۳) کو مانتے ہیں سو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بڑا عاقل سمجھتے ہیں کہ جن کاموں کے لیے ہمارے نزدیک نصرت الٰہی کی ضرورت ہوئی وہ ان کے لیے

(۱) اتباع کے بغیر کیسے گذارہ ہوگا (۲) اس بات کو سب مانتے ہیں (۳) مدد۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کو کافی سمجھتے ہیں پس آپ کے عاقل ہونے میں کسی کو کچھ شبہ نہیں۔ مگر باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ تھی کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ خیر البقاع (بہترین جگہ) کونسی جگہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ جبرائیل سے پوچھ کر بتلاؤں گا۔ حضرت جبرئیل تشریف لائے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بھی معلوم نہیں رب العالمین سے دریافت کر کے بتلاؤں گا۔ پس وہ دریافت کرنے گئے اور جب واپس آئے تو فرمایا کہ اس مرتبہ مجھ کو حق تعالیٰ سے اتنا قرب ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کل ستر ہزار پردے درمیان میں رہ گئے تھے اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ خیر البقاع مساجد ہیں(۱)۔

سو دیکھا باوجود اس علم وفضل کے یہ فرمادیا کہ مجھے نہیں معلوم۔ سو حضور کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات معلوم نہیں ہوتی بے تکلف فرمادیتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم اور آپ نے صرف اسی واقعہ میں ایسا نہیں کیا بلکہ اور بہت سے امور میں حضور نے ایسا ہی کیا ہے۔ خود خدا تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرماتے ہیں: وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔ کہ آپ فرمادیجئے کہ میری یہ عادت نہیں کہ جو بات مجھ کو معلوم نہ ہو اس میں تکلف کروں۔ پس عالم کی یہ شان ہونی چاہئے کہ جو بات معلوم نہ ہو بے تکلف کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب عوام کی تو کیا شکایت علماء بھی جہل کو چھپاتے ہیں۔

کانپور میں کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا کہ سور کا چمڑا پاک ہے یا ناپاک مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے ٹالنے کے لیے کہا کہ اس مسئلہ کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا کہ آخر مسئلوں کی مسلمان ہی کو تو ضرورت ہوتی ہے آپ نے جواب دیا کہ یہ بہت دور کا مسئلہ ہے تم کیا سمجھو گے اس نے کہا کہ آخر آپ بتائیے تو سہی۔

(۱) بہترین جگہ مساجد ہیں۔

تب آپ نے کہا کہ قواعد سے تو پاک معلوم ہوتا ہے غرضیکہ اتنے حیلے حوالے کئے اور پھر مسئلہ غلط بتایا مگر یہ نہیں کہا کہ مجھے نہیں معلوم اور بعضے غلط مسئلہ بتلانے کی جرات نہیں کرتے مگر سائل کو بے وقوف بنا کر اپنی جان بچاتے ہیں۔

چنانچہ ایک گلہری کنویں میں گر گئی تھی۔ ایک شخص اس مسئلے کے دریافت کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب کے پاس گیا جو کہ بڑے معقولی تھے انہیں خود بھی اس کا حکم معلوم نہ تھا اور یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس لیے آپ نے شقیں نکالنی شروع کیں تا کہ وہ ساکت ہوجائے۔ پس فرمانے لگے کہ گلہری کے گرنے میں کئی احتمال ہیں یا تو خودگری ہے یا کسی نے اس کو گرایا ہے۔ اگر خودگری ہے تو دو احتمال سے خالی نہیں یا تو آہستہ چل کر گری ہے یا دوڑ کر۔ اور اگر کسی نے اس کو گرایا ہے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو اس کو گرانے والا آدمی ہے یا جانور۔ اور ہر شق کا جدا حکم ہے (اتنا جھوٹ بولا) اب بتلاؤ کہ کونسی صورت واقع ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ تو معلوم نہیں انہوں نے کہا پھر مسئلہ ویسے ہی پوچھنے چلے آئے۔ جاؤ کام کرو۔

تو یہ بڑے متقیوں کا حال ہے حالانکہ جناب باری تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمایا: وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) میں نے بڑے بڑے علماء کے فتوے دیکھے ہیں کہ انہوں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں۔ اب علماء میں یہ مرض عام ہوگیا ہے کہ کسی مسئلہ میں اپنی لاعلمی کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اب اگر کوئی کہتا بھی ہے کہ مجھے معلوم نہیں تو اس کی بات کا یقین نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا میں نے کہا کہ مجھے

معلوم نہیں تو انہوں نے شکایت کی مجھ سے خفا معلوم ہوتے ہیں جو ایسا کہہ دیا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کو یہ مسئلہ معلوم نہ ہو تو گویا مولوی کو عالم الکل ہونا چاہیے(۱)۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو یہ کیفیت تھی کہ آپ باوجود اس علم وفضل کے فرمادیتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں پھر اور کون عالم الکل ہوسکتا ہے غرض جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی اتباع کرتے تھے جیسے کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا تو پھر اور کون اتباع سے مستغنی ہوسکتا ہے(۲) اور آپ کو اتباع کا حکم بھی تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا آپ کو ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾(۳)۔

دیکھئے یہاں شریعت کا لفظ صاف موجود ہے کہ شریعت کا اتباع کیجئے اس سے کس قدر جی خوش ہوتا ہے کہ مولوی شریعت کے اتباع کو کیسے نہ کہیں خود اللہ تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمارہے ہیں اور ''من الامر'' میں الف لام عہد کا ہے اس سے مراد دین ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کردیا ہے آپ اس کا اتباع کیے جائیں۔

حق تعالیٰ کا اتباع

پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضور سے بڑھ کر تو کوئی نہیں تھا۔ تو آپ کو حکم ہوا اتباع وحی کا اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے انہیں حکم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ﴿فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(۴) سو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے۔ اور علیکم بسنتی میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو۔

---

(۱) مولوی کو ہر چیز کا علم ہونا چاہیے (۲) کون اتباع سے بے نیاز ہوگا (۳) دین کے جس طریقہ پر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کردیا ہے اس کا اتباع کیجئے (سورۃ الجاثیۃ: ۱۸ (۴) سورۃ ال عمران: ۳۱۔

پس حضور کو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہؓ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا۔ پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آ کر عوم کو حکم ہے علماء کے اتباع کا۔ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ ﴾(۱) اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ پھر حضور کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لیے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور ہی کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور ہی سے کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾(۲) (یعنی پھر اس کا بیان کرادینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور فرماتے ہیں: (علمنی ربی فاحسن تعلیمی)(۳)

تقلید کی حقیقت

تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جائے یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین کو دین خوب سمجھایا۔ اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہئے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے اسی لیے اس کو صحابہؓ کیطرف منسوب کردیا گیا ہے کہ سنت الخلفاء الراشدین (۴) علیٰ ھذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہئے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الٰہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے

(۱) سورۃ القمان:۱۵ (۲) سورۃ القیامۃ:۱۹ (۱) ''میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس اچھی ہوئی میری تعلیم'' (کشف الخفاء للعجونی ۱:۲۷، کنز العمال: ۱۳۸۹۵) (۴) خلفاء راشدین کی سنت (سنن ابی داؤد کتاب السنۃ ب:۵، سنن الترمذی:۲۶۷۶)۔

اور چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہئے۔

نسبت حنفی کی حقیقت

پس جب کہ ثابت ہوگیا کہ متبوع مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ اور ائمہ مجتہدین کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جائے تو حنفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز وعدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال وبالذات مراد لیا جائے تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایسا اتباع تو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جائے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز پس معلوم ہوگیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں اس نسبت کو کفر شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط (۱) کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں ایسی ﴿ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ﴾(۲) (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ ﴾(۳) (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان

(۱) قرآن وحدیث سے جو جزءی مسائل نکالے ہیں (۲) سورۃ لقمان: ۱۵ (۳) سورہ یوسف: ۱۰۸۔

لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ﴿ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾[1] (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ تو یہ ایسا ہے کہ عباراتنا شتی وحسنك واحد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدرت را می شناسم

یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو قد سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث وفقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

محبت کا تقاضا

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں اسی طرح جنہوں نے دین کو سمجھا ہے ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آئے یا حدیث کے لباس میں آئے وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را می شناسم

کیونکہ لباس کے بدلنے سے ذی لباس تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔

مجھے ایک واقعہ سے بہت تعجب ہوا کہ میرے ہاں ایک مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص مقیم خانقاہ سے ان مہمان کو دکھلا کر یہ کہا کہ ان کو پہچان لو جب مکان سے کھانا آوے تو انہیں کھلا دینا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے جب کھانا آئے گا تو انہیں کھلا دوں گا تھوڑی دیر کے بعد کھانا آیا تو انہوں نے میرے پاس آکر کہا کہ میں نے ان مہمان صاحب کو بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملے۔ میں نے کہا یہ بیٹھے تو ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ چادر اوڑھے ہوئے تھے ان کے پاس تو چادر نہیں ہے۔ میں نے کہا واقعی معقولی قاعدہ سے تو وہ

(۱) سورۂ ھود: ۱۹۔

نہیں رہے کیونکہ چادر اتر جانے سے تشخص بدل گیا۔ تو جیسے وہ مہمان ایک چادر کے اتر جانے سے بدل گئے ایسے ہی بعضوں نے حدیث کو اور دوسروں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن سے الگ کر دیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں۔

حدیث وفقہ میں تعبیر کے اختلاف کی حقیقت

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک مطب لکھنو کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا۔ مگر ہیں دونوں طب یونانی۔ اسی طرح قرآن وحدیث اور فقہ گو فروعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الٰہی۔ اگر فروعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الٰہی نہیں رہا جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے۔ تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا مطب فروعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی (میرا راستہ) فرمایا تھا اس کو یہاں ''سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَی'' ان لوگوں کا راستہ جو میرے طرف متوجہ ہوئے) فرمارہے ہیں۔ پس ''سبیلی'' اور ''سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَی'' مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾(۱) اور دوسری جگہ فرماتے ہیں: ﴿اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا﴾(۲) اب اس کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب یہ ہے ملت ابراہیم۔ یہ ہے عنوان کا اختلاف۔ باقی اصل اتباع احکام الٰہیہ کا ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہیں۔

لباس کی اہمیت

مگر آج کل لوگ اس لفظ اتباع سے بھی حد گھبراتے ہیں۔ جب ان سے

(۱) ''دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جائیں'' سورۃ الجاثیۃ: ۱۸ (۲) ''کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے'' سورۃ النساء: ۱۲۵۔

کہا جاتا ہے کہ علماء کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ مولویوں نے تو شریعت بڑھالی ہے کہ ہر بات کو اس میں شامل کرلیا ہے حتی کہ لباس کو بھی جزو مذہب بنادیا ہے حالانکہ وہ ایک دنیوی امر ہے۔ پس ان کا اتباع کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ لباس کے مسئلہ میں تو ذرا بھی اخفاء نہیں (۱)۔ میں اس کی نظیر دیتا ہوں۔ دیکھئے فوج کی وردی معین ہوتی ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ معائنہ کے لیے آئیں اور کانسٹیبل وردی نہ پہنیں۔ تو یہ بھی وہی بات ہے بلکہ شریعت میں لباس کے اندر بہت گنجائش دی گئی ہے کہ جن لباسوں کی ممانعت کی ہے ان کی تعیین کردی ہے اور باقی سب کی اجازت دے دی ہے اور یہاں جس کی اجازت ہے اس کو متعین کردیا ہے اور باقی سب کی ممانعت کردی ہے۔ یہاں وردی کی تعیین میں کلام کرنے کی کسی کو جرات نہیں ہوگی مگر اللہ میاں چونکہ دنیا میں کچھ نہیں کہتے اس وجہ سے دین کے اندر ہر شخص کو جرات ہے۔ تو اب اگر ریل پر کچھ نہ کہا تو کیا اسٹیشن پر بھی کچھ نہ کہیں گے۔ اب بہت جلد اسٹیشن پر پہنچ جاؤ گے وہاں بے ٹکٹ بیٹھنے کی سزا ملے گی۔

فسوف ترى اذا انكشف الغبار افرس تحت رجلك ام حمار (۲)

اس وقت حال معلوم ہوجائے گا جیسا کہ سپرنٹنڈنٹ معائنہ لکھ لے جائے تو ابھی گو اس نے کچھ نہیں کہا مگر جب پیشی ہوگی اس وقت پتہ چلے گا اور اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو نقد ہی چاہئے اور آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ تو ادھار ہے فی الحال تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اندر نقد مضرت (۳) بھی ہے کہ کفار جو

(۱) کوئی پوشیدگی نہیں (۲) ”آنکھوں کے سامنے سے غبار ہٹنے دو۔ ہٹنے دو۔ عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر“ (۳) نقد نقصان۔

کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک مبغوض (۱) ہیں ان کے ساتھ مشابہت ہے تو عنداللہ مبغوض ہونا کیا یہ مضرت نہیں ہے (۲) اور نقد ہے۔ اگر اس پر کہا جائے کہ صاحب کفار کی مشابہت سے کوئی کافر تو نہیں ہوجائیں گے اور اصل مضرت تو یہ ہے تو میں کہوں گا کہ جیسے کفار کی وضع سے کافر نہیں ہوجاتے اسی طرح بیگم صاحبہ کی وضع بنانے سے بیگم نہ بن جائیں گے پھر ہم تو جب جانیں کہ بیگم صاحبہ کی وضع بنالیں اور صرف ایک گھنٹہ کے لیے آکر کرسی پر جلوہ افروز ہوجائیں۔ افسوس کہ یہ عذر یہاں تو مانع ہے اور وہاں نہیں۔

بس حضرت بالکل رسم کا اتباع ہے ورنہ جو خرابی عورت کا لباس پہننے میں ہے وہی کفار کا لباس پہننے میں ہے۔ تو کفار کی وضع اختیار کرنے میں یہ خرابی نقد ہے اس کا کوئی معقول جواب دیں۔ سو ان کے پاس معقول جواب تو کچھ بھی نہیں اور یوں ہر بات میں لا تسلم (ہم نہیں تسلیم کرتے) کہنا تو طوطے کی طرح دریں چہ شک (اس میں کیا شک) کہنا ہے (۳)۔ کوئی معقول جواب لائیں۔ غرض وضع کے اندر مضرت ادھار ہو یا نقد ہو اس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں۔

دین کا اختصار

مگر اب لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ شریت تو مختصر تھی اور مختصر بھی اتنی کہ من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ (یعنی جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا جنت میں داخل ہوگیا) صرف لا الٰہ الا اللہ ہی کہنا کافی تھا۔ حتی کہ بعض تعلیم یافتوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس میں محمد رسول اللہ کے قائل ہونے کی بھی قید نہیں۔ پس منکر رسالت کو بھی نجات ہوگی۔ ایک صاحب اس سے بھی ترقی کر کے کہتے ہیں کہ منکر توحید کو

(۱) ناپسندیدہ (۲) کیا یہ نقصان نہیں ہے (۳) کسی نے اپنے طوطے کو صرف ایک لفظ دریں چہ شک سکھا دیا تھا پھر جب اس سے کوئی بات کرو تو وہ اس کے جواب میں دریں چہ شک کہتا ہے۔

بھی نجات ہوگی کیونکہ توحید امر طبعی ہے اور امر طبعی کسی طرح زائل نہیں ہوسکتا۔ بس جو شخص زبان سے اسکا انکار کرتا ہے حقیقتاً اس کا قائل ہے۔ اس لیے اس کی بھی نجات ہوجائے گی۔ گویا لا الٰہ الا اللہ بھی نہ رہا شریعت سے یہاں تک استثناء کی کہ اس کے تمام اجزاء کو مستثنیٰ کرلیا۔ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے برابر ہوگیا اور مستثنیٰ منہ کچھ بھی نہ رہا۔ معاذ اللہ اس زیادتی کی کچھ انتہا ہے۔ صاحبو! اب ہماری وہ حالت ہوگئی ہے کہ ہم لوگوں کی کوئی بات بھی اصل حالت پر نہ رہی کسی کا شعر ہے۔

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب(۱)

تمام عالم میں ایک طوفان برپا ہے ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾(۲) (خشکی وتری سب میں فساد برپا ہے) اور یہ ایسا اختصار ہے جیسا کہ ایک بڑھیا نے ایک باز کو پکڑ لیا تھا اور اس کے ٹیڑھے ٹیڑھے ناخن اور چونچ دیکھ کر اس کو بہت ترس آیا کہ ایسے ناخنوں سے چلتا کیونکر ہوگا اور س چونچ سے دانہ کیسے چگتا ہوگا پس اس نے اس کو مضر سمجھ کر کتر دیا۔(۳)

جیسے اس نے باز کا اختصار کیا تھا اسی طرح ہمارے بھائی دین کا اختصار کررہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولویوں نے شریعت کو پھیلا بہت دیا۔ تو سمجھ لو کہ شریعت مولویوں کی پھیلائی ہوئی نہیں ہے۔ ہاں اس اعتبار سے منسوب ہے مولویوں کی طرف کہ جو خدا اور رسول کے کلام کا مطلب تھا۔ انہوں نے اس کی تفسیر کردی ہے۔ اس لیے اس حکم کو ان کا فتویٰ کہہ دیا جاتا ہے پس ان کی طرف اس کی نسبت ایسی ہے جیسی کہ اس آیت میں کہ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا(۴) (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو) باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا

(۱) ''اے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! ذرا خواب راحت سے اٹھئے تو سہی۔ دیکھئے کہ آپ کی امت کس بلا میں گرفتار ہے'' (۲) سورۃ الروم: ۴۱ (۳) نقصان دہ سمجھ کر کاٹ دیا (۴) سورۃ النساء: ۱۲۵۔

ہے کہ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (آپ دین ابراہیم کا اتباع کیجئے) اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ جو ان کا طریقہ ہے اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقہ کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی اس تقریر سے سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الٰہیہ کا نام ہے اس کے بہت سے لقب ہیں۔ اس میں سے ایک لقب ملت ابراہیم بھی ہے۔ چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملت ابراہیم رکھا گیا ہے۔ تو واقع میں ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملت الٰہیہ کا اتباع ہے جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کردی گئی تو جیسے یہاں پر ملت الٰہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر اس دین کو مذہب شافعی یا مذہب ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسول کا تو حکم نہیں ہے حالانکہ وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلا دیا ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ''القیاس مظهر لا مثبت'' (یعنی قیاس حکم شرعی کو ظاہر کرنے والا ہے اس کو ثابت کرنے والا نہیں) پس اب بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم علماء ہی کا اتباع لازم ہوا کیا خوب کہا ہے۔

چونکہ شد خورشید ومارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش جز چراغ

یعنی جب آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہوسکتا ہے تو جب صاحب وحی ہماری نظروں سے غائب ہوگئے تو سوائے اتباع علماء کے اور کیا چارہ ہوسکتا ہے۔

چونکہ گل رفت وگلستان شد خراب بوئے گل را از کہ جوئم از گلاب(۱)

(۱) ''جب پھولوں کا زمانہ رخصت ہوا اور باغ پر خزاں آگئی تو میں پھول کی خوشبو گلاب میں تلاش کرتا ہوں''۔

یہ شعر بجمیع اجزائیہ (اپنے تمام اجزاء کے اعتبار سے) تو یہاں منطبق نہیں ہے کیونکہ گلستان شریعت بحمداللہ ویسا ہی ہرا بھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے۔ اس لیے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہئے جن کے اندر صاحب وحی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ فیوض ہیں وہ حضور ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ پس بغیر ان کا اتباع کیے ان کا چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کرلیا جاتا ہے اور گویہ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ (راستہ ان لوگوں کا جو منیب ہیں) کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل رسول ہے علماء چونکہ اسے ہم کو سمجھا دیتے ہیں اسی معنی کا واسطہ ہے صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کرکے سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ کہا گیا۔

خلاصہ یہ کہ اتباع کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جو سرے سے اتباع ہی کو ضروری نہیں سمجھتے اور کسی کا اتباع ہی نہیں کرتے۔ اس سے تو ان لوگوں کی اصلاح کی گئی ہے۔

معیار اتباع

اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس وناکس (۱) کا اتباع کرنے لگتے ہیں سو آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ ''سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ'' (ان لوگوں کے راستہ کا جو منیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ'' واتبع من اناب الی ''(ان لوگوں کا اتباع جو میری طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے

(۱) ہر ایرے غیرے۔

اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لیے ''سبیل'' کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ انکے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع۔ یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے۔ پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہئے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے) کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''یھدی الیه من ینیب'' (یعنی جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کرتے ہیں) کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔

قابل اتباع شخص

پس اس سے معلوم ہوگیا کہ توجہ الی اللہ کے لیے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب ''اناب الی'' سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو اور عمل بدوں علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو کہ جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو بس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔

ایک علم دین اور ایک عمل دین۔ اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں ان میں نہ عمل ہے نہ علم اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہئے اور پھر اس پر یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ! کیا جامع کلام ہے کہ ایک

اناب کے لفظ میں تینوں امور (علم وعمل وتوجہ الی اللہ) کی طرف اشارہ فرمادیا۔ پس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے قابل وہ ہوگا جس میں یہ تینوں باتیں ہوں۔ یہ میں اس لیے بیان کرتا ہوں کہ اس وقت لوگوں کو قابل اتباع اور کاملین کی پہچان نہیں رہی کہ ہر کس وناکس کے معتقد ہوجاتے ہیں اور صرف معتقد ہی نہیں بلکہ غلام بننے کو تیار ہوتے ہیں خواہ کوئی بھی آجائے یہ ان کے مرید ہوجائیں گے چونکہ آج کل لوگ اس طرح آنکھ بند کرکے ہر ایک کے متبع ہوجاتے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اتباع کا ایک معیار ہونا چاہئے اور صحیح معیار اس کا اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ جس میں تین چیزیں (علم اور عمل اور توجہ الی اللہ) ہوں وہ ہے قابل متبوع ہونے کے بس اس کا اتباع کیجئے۔ پس متبوع میں تین چیزیں دیکھئے ایک علم دوسرے عمل کہ کسی گناہ کبیرہ میں مبتلا نہ ہو اور صغیرہ پر اصرار نہ ہو اور تیسرے توجہ الی اللہ جس کی شناخت یہ ہے کہ اس کی صحبت میں ایک خاص برکت ہو۔ اس کی صحبت حق تعالیٰ کی مذکر (یاد دلانے والی) ہو۔

پس جس شخص میں یہ تمام خوبیاں ہوں وہ ہے اس قابل کہ اس کے طریقہ کا اتباع کیا جائے۔ خواہ وہ طریقہ خود اس کی زبان سے بلا واسطہ پہنچے یا کسی معتبر واسطہ سے کیونکہ اتباع کیا جاتا ہے علماء مجتہدین کے طریقہ کا، اور تمام علماء مجتہد ہوتے نہیں، پس وہ علماء کہ جو مجتہد نہیں ہیں وہ بھی چونکہ مجتہدین ہی کی تحقیقات بیان کرتے ہیں اس لیے ان کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجتہدین کا اتباع جو کیا جاتا ہے ان میں درویشی کا رنگ کہاں تھا جس کو انابت سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے۔

آں طرف کہ عشق مے فزود درد بو حنیفہ شافعی در سے نکرد

یعنی جس چیز سے عشق اور درد کو ترقی ہوتی ہے اس کا ابوحنیفہ اور شافعی نے

کبھی درس نہیں دیا۔ اگر یہ مولانا کا شعر ہے مجھ کو اس وقت یاد نہیں۔ تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ ان کے تصوف کا لون جدا تھا کہ وہ زیادہ تر عبادات اور معاملات کی اصلاح میں مشغول تھے۔ ان متعارف کیفیات کا وہ اہتمام نہ فرماتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ کا علمی شغف

چنانچہ امام ابو یوسف کا قصہ ہے کہ وہ مرض وفات میں تھے۔ ایک شخص ان کی عیادت کو آئے۔ تو دیکھا آپ کچھ سوچ رہے تھے انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ فرمایا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ رمی جمار راکباً (سوار ہوکر) افضل ہے یا ماشیاً (پیدل ہوکر) تم بتلاؤ کہ ان میں کونسی افضل ہے۔ انہوں نے کہا کہ ماشیا افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطات کہ تم نے غلطی کی۔ پھر انہوں کہا کہ راکبا افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اخطات کہ یہ بھی صحیح نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ جس رمی کے بعد اور رمی ہو وہ تو ماشیا افضل ہے اور جس رمی کے بعد رمی نہ ہو تو وہ راکبا افضل ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس کے بعد یہ شخص وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دروازہ تک پہنچے تھے کہ گھر سے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ آپ کی وفات ہوگئی اور یہ شخص حیران رہ گئے کہ اللہ اکبر ان حضرات کو علم دین سے کس قدر محبت ہے کہ مرتے دم تک اسی میں مشغول رہتے ہیں۔

امام محمدؒ کا رنگ تصوف

سو ان حضرات کے تصوف کا یہ رنگ تھا۔ امام محمد سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی؟ فرمایا کہ کتاب البیوع ہے نہیں، اس سے معاملات درست ہوتے ہیں اور اکل حلال میسر ہوتا ہے اور اکل حلال سے

باطن میں نور پیدا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ معاملات وغیرہ کا درست بھی ضروری ہے اب لوگوں کے نزدیک معاملات تصوف میں داخل ہی نہیں رہے آج کل جو اپنے کو صوفی کہتے ہیں کہ ان کے نہ معاملات درست نہ اخلاق۔ غرض یہ کہ اصل مقصود انابت ہے خواہ لون اس کا کوئی ہو۔ پس جن چیزوں کو اس کے حصول میں دخل ہوگا وہ تو مقصود ہوں گی اور جن چیزوں کو اس میں دخل نہ ہوگا وہ مقصود نہ ہوں گی۔

کشف وکرامات کی حقیقت

اب دیکھنا چاہئے کہ کشف وکرامت وغیرہ جس کو آج کل لوگ مقصود سمجھتے ہیں یہ چیزیں انابت کے اندر کچھ دخل رکھتی ہیں یا نہیں۔ اس میں حقیقت بتلاتا ہوں سنیئے! انابت کے لیے قرب ضروری ہے پس جس بات سے قرب ہو وہ انابت میں دخل رکھتی ہے اور جس بات سے کچھ قرب نہ ہو اس کو انابت میں کچھ دخل نہیں کیونکہ ان سے کچھ قرب نہیں ہوتا اور اگر تین مرتبہ سبحان اللہ کہئے تو اس سے قرب ہوتا ہے پس ہزار کشف وکرامت سے تین مرتبہ سبحان اللہ کہنا افضل ہے حضرت جن اعمال کو آپ حقیر سمجھتے ہیں وہی اصل مقصود ہیں۔

اس وقت بعضے اہل طریقہ کو بھی یہ غلطی ہوئی ہے کہ وہ حالات اور کیفیات کو اصل مقصود سمجھ گئے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ مقصود بالذات یہی نماز روزہ ہیں۔ کیفیات وغیرہ تو انہیں نماز روزہ کی درستی کے لیے ہیں۔ اعمال اور کیفیت کی بالکل ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک ہوتی ہے غذا اور ایک ہوتی ہے دوا۔ مگر مقصود غذا ہوتی ہے اور دوا صرف اس لیے ہوتی ہے کہ حالت مرض میں چونکہ غذا جزو بدن نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے غذا کے جزو بدن ہونے کی قابلیت ہوجائے پس دوا مقصود نہیں ہوتی۔

سو جیسے اصل مقصود غذا ہے اور دوا محض معین ہے۔ اسی طرح یہاں اصل مقصود نماز روزہ ہے اور کیفیات بطور دوا کے ہیں کہ ان کو مجاہدات سے محض اس لیے حاصل کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ نماز روزہ کی قابلیت پیدا ہوجاوے جیسے کہ دوائی کھائی جاتی ہے کہ اس سے ہم میں اتنی قابلیت ہوجاوے کہ غذا جزو بدن بنے۔ پس یہ مجاہدات معالجات کے درجہ میں ہوئے۔

کیفیت نماز

اگر کوئی یہ کہے کہ نماز کی قابلیت تو کیفیات پر موقوف نہیں ہے جن لوگوں نے مجاہدات نہیں کئے اور ان کو کیفیات حاصل نہیں ہوئیں۔ نماز پڑھتے ہیں تو بات اصل میں یہ ہے کہ نماز کے بھی حقوق ہیں۔ اگر یہ نماز پڑھتے ہیں مگر جو اس کے حقوق ہیں وہ ان سے ادا نہیں ہوتے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مقبلاً علیها بقلبه۔ پس نماز کی طرف دل متوجہ ہو۔ پس نماز کے اندر خشوع اور خضوع بھی ہونا ضروری ہے اور فرماتے ہیں ان تعبد اللّٰه كانك تراه (۱) کہ حق تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا خدا کو دیکھتے ہو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خیال کرلیا کرو کہ خدا کو دیکھ رہے ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی عبادت کرو جیسے کہ اگر خدا کو دیکھتے ہوتے تو اس وقت عبادت کس طرح کرتے اور ظاہر ہے کہ اس وقت نماز کے اندر کسی بات کی فروگذاشت نہ کرتے۔ حضور قلب بھی ہوتا ہے اور خشوع بھی تعدیل ارکان بھی ہوتی۔ پس اب اس طرح کی عبادت کرو اور فان لم تكن تراه فانه يراك یہ اس کی علت ہے۔ یعنی ایسے عبادت اس لیے ضروری ہے کہ گو تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے مگر خدا تو تم کو دیکھتا ہے اور اس کا مقتضا بھی اسی اہتمام کے ساتھ عبادت کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر تم خدا تعالیٰ کو دیکھتے ہو تو جیسے اس کا یہ مقتضا تھا

(۱) الصحیح البخاری ۶: ۱۴۴، السنن الکبری للبیہقی: ۱/۲۰۳۔

کہ نماز کے اندر کوئی فروگذاشت نہ ہو(۱) اسی طرح اس کا بھی یہی مقتضا ہے۔ لہٰذا اب بھی ویسی نماز پڑھنی چاہئے جیسی اس صورت میں پڑھتے۔

درجاتِ احسان

پس یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور اسی لیے اس کا نام احسان ہے یعنی نیکو کردن عبادت (یعنی عبادت کو اچھی طرح ادا کرنا) پس مطلوب ایسی عبادت ہے نماز ہو تو ایسی، قرآن مجید کی تلاوت ہو تو ایسی ہو۔ مطلوب تو عبادت کا یہ درجہ ہے اور یہ درجہ ہم کو حاصل نہیں ہے۔ پس اس کو حاصل کرنا ضروری ہے اور تحصیل کے طریق مختلف ہیں تو جن کی استعداد کامل ہے ان کی تو ذرا توجہ بھی کافی ہے اور جن کی استعداد ضعیف ہے ان کی صرف توجہ سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی بعض دفعہ تو خود حدیث ہی کے لیے یہ توجہ ناکافی ہوتی ہے پس ضرورت اس کی ہوئی کہ توجہ کو یکسوئی کا عادی کریں پھر اس سے نماز میں کام لیں۔ صحابہ کی استعداد(۲) چونکہ کامل تھی۔ ان کو محض توجہ کافی تھی اور ہماری استعداد میں ہوا ضعف اور ہم کو ہوا حضور سے بعد(۳)۔ اس لیے اب ہم کو ضرورت ہوئی اس بات کی کہ کچھ شغل کریں تاکہ توجہ میں یکسوئی حاصل ہو جائے پھر اس سے عبادت میں کام لیں تاکہ جیسی عبادت مطلوب ہے ویسی ہی ادا ہو۔ اس میں لوگوں کو آج کل بڑی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں کہ ناواقف لوگ مجاہدات سے کیفیات مکاشفات ہی کو اصلی مقصود سمجھتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہو کر لذت حاصل کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ بہت خطرناک بات ہے اس سے غلطی میں پڑ جانے کا بہت قوی شبہ ہے کیونکہ کیفیات تو اہل باطل کو بھی ہو جاتی ہیں رہے مکاشفات مثلاً الوان واصوات(۴)

(۱) کوئی کوتاہی نہ ہو (۲) صلاحیت (۳) ہماری استعداد کمزور اور ہمارا زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دور (۴) مختلف رنگ اور آوازیں۔

سو یہ بہت کم ملکوتی ہوتے ہیں بلکہ اکثر متخلیہ کی صورتیں ہیں (۱)۔ اور اگر ملکوتی بھی ہوں تو وہ ہے کیا چیز وہ بھی مخلوق ہی تو ہے پس جب آپ اس کے تماشہ میں لگ گئے اور اس سے لذت حاصل کرنے لگے۔ تو آپ نے ایک مخلوق کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کیا تو ہر حال میں توجہ الی المخلوق (مخلوق کی طرف توجہ) ہی رہی اور مقصود ہے توجہ الی الخالق (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا) پس مقصود سے اب بھی دور ہی رہے۔

حاجی صاحب کی تحقیق انیق

اسی لیے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ حجابات نورانی حجابات ظلمانی سے زیادہ شدید ہیں (۲) کیونکہ طالب ان کو مقصود سمجھ لیتا ہے اس وجہ سے ان میں مشغول رہ کر حق تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے (۳) اور حجابات ظلمانی کو ہر شخص مذموم (۴) سمجھتا ہے اس لیے ان کے ازالہ کی فکر کرتا ہے۔ پس چونکہ حجابات نورانی بہت اشد ہیں۔ اسی لیے ہمارے ہاں اس کی نفی کی تعلیم ہے۔ سالک کا تو یہ حال ہونا چاہئے کہ۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست ہر چہ بروے می رسی بروی مایست (۵)

حقیقتِ اشغال

خلاصہ یہ کہ اشغال (۶) سے مقصود یہی ہے کہ طبیعت کو ان کے ذریعہ سے یکسوئی کی عادت ہو اور پھر اس یکسوئی سے عبادت میں کام لیں۔ پس یہ دوا ہیں غذا نہیں۔ جیسے دوا اصلاح مزاج (۷) کے لیے ہوتی ہے اسی طرح یہ اشغال اصلاح حال واصلاح طبیعت کے لیے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ منتہی (۸) اشغال کو البتہ ان حالات کے بقاء کے لیے کسی قدر شغل کرتا رہے تو وہ دوسری بات ہے۔ باقی

(۱) اکثر خیالات کی من گھڑت صورتیں ہوتی ہیں (۲) نورانی پردے ظلمانی پردوں سے زائد ہیں (۳) حق تعالیٰ تک پہنچنے سے رک جاتا ہے (۴) برا (۵) ''اے بھائی! بے نہایت درگاہ ہے جس مقام پر پہنچو وہاں مت ٹھہرو بلکہ آگے بڑھو'' (۶) صوفیوں کے مجاہدات (۷) طبیعت کی درستی (۸) آخری منزل پر پہنچنے والا۔

سب اشغال چھوٹ جاتے ہیں غالب ذکر رہ جاتا ہے تو یہ ہے حقیقت اشغال اور کیفیات کی کہ یہ سب توجہ الی اللہ کے اسباب ہیں اور قرب میں خود ان کو کچھ دخل نہیں بلکہ اس میں دخل ہے اعمال کو جن سے نسبت مع اللہ حاصل ہو۔ جس سے حق تعالیٰ کے احکام بے تکلف ادا ہونے لگیں اور ذکر بے تکلف ہونے لگے اور اس ادا احکام اور ذکر سے پھر ایک اور شے مقصود ہے یعنی رضاء حق۔ پس جس چیز کو رضاء میں دخل ہے وہ تو جزو تصوف ہے اور جس چیز کو اس میں دخل نہیں وہ تصوف سے خارج ہے اور جو اس میں مخل ہو وہ تصوف کے منافی ہے۔

اب تو یہ غضب ہے کہ بعضے لوگ معاصی کو بھی مضر اور تصوف کے منافی نہیں سمجھتے (۱) بلکہ شغل سے جو ایک حرارت پیدا ہو جاتی ہے اسی کو کافی سمجھتے ہیں گو اعمال کیسے ہی ہوں۔ حالانکہ صرف اس حرارت کے حاصل ہونے سے مقصود تک رسائی نہیں ہو جاتی۔ ابھی تو مقصود سے اتنا دور ہے جیسے مکہ جانے والا بمبئی پہنچا ہو تو یہ بمبئی ہے مکہ نہیں ہے مکہ تو ابھی بہت دور ہے۔ پس اب اس حرارت وذوق سے طاعات میں کام لینا چاہئے تب کہیں مقصود تک رسائی ہوگی اب بعض لوگ صرف اسی کیفیت کو بزرگی سمجھتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ اس کو بزرگی سمجھنا بہت خطرناک امر ہے۔ کیونکہ جس شخص کا ایسا اعتقاد ہوگا اس نے اگر حرام غذا کھائی یا کسی پر ظلم کیا تو بزرگی واقع میں تو گئی (۲) مگر یہ شخص ابھی تک دھوکہ میں ہے کہ اپنے کو ویسا ہی سمجھے ہوئے ہے جیسا کہ پہلے تھا کیونکہ اس کے نزدیک بزرگی نام ہے کیفیات کا اور معاصی (۳) سے کیفیات زائل نہیں ہوتیں۔ رات کو ذکر کرنے بیٹھے تو پھر غوطہ سا لگ گیا۔ پس جب اس کی پہلی کیفیت زائل نہ ہوئی تو یہ سمجھے کہ معاصی بزرگی میں کچھ مخل نہیں (۴)۔ اس لیے بار بار کہتا ہوں کہ جو چیزیں انابت میں مخل ہیں وہ بزرگی کے بھی منافی ہیں۔

(۱) گناہوں کو بھی نقصان دہ اور تصوف کے خلاف نہیں سمجھتے (۲) بزرگی رخصت ہوئی (۳) گناہوں سے (۴) یہ سمجھے کہ ارتکاب گناہوں سے بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

منیب کا طریقہ

غرض یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس میں انابت دیکھو اس کے طریقہ کا اتباع کرو اور وہ طریقہ واقع میں خدا اور رسول کا طریقہ ہے پھر اس کو منیب کا طریقہ جو کہا گیا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی کتاب۔ تو کتاب حقیقتاً تو اس کی نہیں ہوئی کیونکہ اس کے تمام مضامین اس شخص کے نہیں ہوتے۔ مثلاً صحیح بخاری کہ اس کے اندر جو حدیثیں ہیں وہ امام بخاری کی تو نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ پس کتاب کو اس شخص کی صرف اس معنی سے کہا جاتا ہے کہ اس نے اس کو جمع کیا ہے اسی طرح یہ طریقہ حقیقت کے اعتبار سے تو حق تعالیٰ کا ہے اور منیب کا صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ اس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پس اتباع کا یہ معیار ہے اب جس سے عقیدت پیدا کرتے ہو یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اس معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔

شریعت کی آسانی

اس سے ایک دوسری بات بھی ثابت ہوئی کہ دین کس قدر سہل ہے دیکھئے حق تعالیٰ نے ہم کو کیسا آسان معیار بتلایا ہے۔ اب آج کل لوگ چونکہ اس معیار سے کام نہیں لیتے اور نئے نئے معیار تراشتے ہیں اس لیے بہت پریشان ہوتے ہیں اور ہزاروں فرقے ہوتے جاتے ہیں۔ کوئی اہل قرآن ہے کوئی عامل بالحدیث ہے۔ بعض نے پنجاب میں نبوت ہی کا دعویٰ کر دیا۔ اب اگر معیار صحیح نہ ہو تو کتنی پریشانی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہوں نے اپنی تھوڑی عمر میں مذاہب منسوبہ الی الاسلام (اسلام کی طرف مذاہب منسوب) میں کئی کئی مذہب اختیار کئے۔ بعض نے اسلام کو چھوڑ کر دوسرے خارستان کی بھی زیارت کی کہ گویا

یصبح مومنا و یمسی کافرا (۱) کے مصداق ہوگئے اور ان کی وہ حالت ہوگئی کہ۔

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگر یست (۲)

آج کل لوگوں کی اس تلون مزاجی (۳) کی وجہ سے واللہ اتنی بدگمانی بڑھ گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہوجائے تب بھی اس کے اسلام پر اطمینان نہیں ہوتا مگر خیر یہ شریعت کی خوبی ہے کہ وہ ہر مرتبہ ان کے اسلام کو قبول کرلیتی ہے۔

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ . . . . !

(یعنی سو مرتبہ اگر توبہ توڑ چکے ہو تو پھر آجاؤ)

شریعت کا مسئلہ ہے کہ چاہے کیسا ہی شخص ہو جب وہ اسلام میں داخل ہونا چاہے اس کا اسلام قبول کرلیا جائے گا کیونکہ شریعت کی یہ تعلیم ہے اس لیے مسلمانوں کی قوم بہت بھولی ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ کسی نے کیسی ہی برائی کی ہو مگر جب وہ عذر کرتا ہے یہ فوراً اس کو قبول کرلیتے ہیں کیونکہ ان میں کرم بہت ہوتا ہے۔ حدیث ہے المومن عز کریم (۴) پس کرم کی وجہ سے ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں اور دھوکہ میں آجاتے ہیں سو کرم علت ہے بھولے ہونے کی، مسلمانوں میں سب جگہ ایسا ہی دیکھ لیجئے کہ جوان سے کہے کہ میں تمہارا دوست ہوں بس یہ اس کو دوست سمجھنے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ دوستی کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ترقی متعارف ان کو نہیں ہوتی کیونکہ اس کے لیے چالاکی کی ضرورت ہے غرض یہ شریعت کی خوبی ہے کہ ایسوں کا اسلام قبول کرلیتی ہے۔ حاصل یہ کہ بعضوں نے کفر کی بھی سیر کی۔ سو ان سب خرابیوں کی وجہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلائے ہوئے معیار کو بھول گئے۔ اگر مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ کے معیار کو مقرر کرلیتے تو ہرگز یہ خرابیاں نہ ہوتیں۔

(۱) ''صبح کرتے ہیں مومن ہوکر اور شام کرتے ہیں کافر ہوکر'' سنن الترمذی: ۲۱۹۷، المستدرک للحاکم: ۳/۵۲۵، ۵۳۱ (۲) ''یعنی تمہارے قدیمی خدا سے میں بیزار ہوں مجھ کو ہر روز نئے خدا کی ضرورت ہے'' (۳) مزاج کی رنگینی (۴) ''مومن کریم بھولا ہوتا ہے'' سنن ابی داؤد: ۴۷۹۰، سنن الترمذی: ۱۹۶۴۔

متبوع کی شناخت

بعضے اتباع تو اہل انابت ہی کا کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ خودرائی کرتے ہیں کہ ان منیبین میں سے کسی ایک کو اتباع کے لیے متعین نہیں کرتے جس مسئلہ میں ان میں سے جس کا چاہا اتباع کرلیا۔ یہ خودرائی بھی بہت مضر ہے۔ مناسب یہ ہے کہ زندہ لوگوں میں سے ایک شخص کو اپنی متبوعیت (۱) کے لیے پسند کرلیجئے اور میں یہ بہت فائدہ کی بات بتلاتا ہوں۔ تجربہ سے معلوم ہے کہ سلامتی اسی کے اندر ہے گو اہل انابت متعدد ہوں مگر متبوع ان میں سے ایک کو بنالیا جائے اور اسی کے سبیل کا اتباع کیا جائے۔

پس اب ان میں سے ایک کو ترجیح دینے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ سو وہ یہ ہے کہ جس کا انابت زیادہ ہو یعنی یہ دیکھ لیجئے کہ اس کا علم کیسا ہے تقویٰ کی کیا حالت ہے۔ پھر دیکھئے کہ نسبت مع اللہ کیسی ہے اور یہ معلوم ہوگا کہ اس کی صحبت میں رہنے سے یعنی اگر اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہو تو سمجھو کہ اس کی نسبت کامل ہے اور وہ متبوع بنانے کے قابل ہے اور اگر اپنی استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کی صحبت کا اپنے اندر یہ اثر محسوس نہ ہو کہ دنیا کی محبت کھودو تو صرف اتنی بات سے بدگمان نہ ہوجائے کیونکہ استعداد ضعیف ہونے کی وجہ سے اثر بھی بہت ضعیف ہوتا ہے جس کا ابھی احساس نہیں ہوتا۔ سالہا سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کیا اثر ہوا۔ پس جب اپنے اندر اثر محسوس نہ ہو تو اس کے پاس رہنے والوں کو دیکھئے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی ہے۔ اگر ان میں سے اکثر کی حالت اچھی دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ شخص کامل ہے۔

حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو اہل باطل ہوتا ہے اس کے مخصوصین اور مقربین نہایت بدتر حالت میں ہوتے ہیں ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ لوگ ان کو بزرگ سمجھتے تھے اور ان سے پانی پڑھوا کر لے جاتے تھے ان کے مخصوصین کی یہ حالت تھی کہ موٹے موٹے دانوں کی تسبیح لوگوں کو دکھلانے کے لیے پاس رکھتے تھے

(۱) اپنا بڑا بنانے کہ اسی کا اتباع کرے۔

اور نماز روزہ کچھ نہ کرتے تھے۔

اہل باطل کے پاس رہنے والوں میں اکثر کی حالت اچھی ہو تو سمجھ لو کہ ضرور وہ شخص کامل ہے۔ اس کو متبوع بنالو اور ہرگز نہ چھوڑو اور اگر اس کے مخصوصین میں اکثر کی حالت خراب دیکھو تو سمجھو کہ اسی کی حالت خراب ہے۔ خرابی خود اس کے پاس کے رہنے والوں میں کہاں سے آئی۔

بقول رامپور کے ایک شخص کے کہ وہ اہل باطن میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں جا پھنسا تھا اور بات کی پچ کی وجہ سے اس کو نہیں چھوڑتا تھا کسی نے اس سے کہا کہ میں میاں تم کو پیر سے کچھ حاصل بھی ہوا' اس نے کہا کہ جب سقاوہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آئے (۱)۔

ایسے شخص کو چھوڑو۔ وہاں اتنی بات ہے کہ اس کو برا مت کہو برا کہنے سے کیا فائدہ۔ اگر کسی طبیب کا علاج پسند نہ آئے تو اس کا علاج نہ کرو مگر اس کو برا بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ پس منبیین کے تعدد کی حالت میں جس میں انابت اقویٰ معلوم ہو اس کو اختیار کرلو اور اس کے ہوتے ہوئے صرف اسی کا اتباع کرو۔ اسی میں راحت ہے۔ فی نفسہ یہ بھی جائز ہے مختلف لوگوں کا اتباع ہو۔ مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے۔

سلف اور خلف کا فرق

سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہ سے پوچھ لیا کبھی اوزاعی سے۔ اور اسی سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے سو فی نفسہ تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہوگیا ہے اس کے سمجھنے کے لیے اول ایک مقدمہ سن لیجئے۔ وہ یہ کہ حالت غالب کا اعتبار ہوتا ہے سو حالت غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدین غالب

(۱) جب مٹکے ہی میں نہ ہو تو لوٹے میں کہاں سے آئے گا۔

تھا ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا اتفاقی طور پر ہوتا تھا اور یا اس لیے کہ جس کے قو میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے پس اگر تدین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کرنے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی حدیث میں ہے ثم یفشو الکذب کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو جتنا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے۔ اب مختلف لوگوں سے اس لیے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہوگی اس پر عمل کریں گے۔

من پسند فتوے کی تلاش

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا۔ پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا ان کا نکاح جائز نہیں ان میں جدائی کر دینی چاہئے۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی ہے اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے۔ میں نے کہا کہ تفریق میں اول تو بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے۔ جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا۔ کہنے لگے کہ اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا۔ میں نے کہا کہ خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو حرمت کے حق میں یکساں ہے۔

جب میرے پاس سے انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی پہنچے وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس

شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لیے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا حرمت ثابت ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے جواب لکھ دیا کہ لاتحرم المصته ولا المصتان(۱) آپ بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لا کر دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کرلیا جائے گا تو کون سی خرابی ہے۔

آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندہ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے کتنے گھونٹ پیئے تھے اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی کیا وجہ ان کے فتوے کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا اور ان کے فتوے کو نہ مانا جنہوں نے اس کو حرام بتلایا۔ حالانکہ جنہوں نے حلال بتلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اول تو یہ شخص ان کے مذہب پر نہ تھا۔ جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے کام نکلتا ہے تو ان کا مذہب لے لیا اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہوگیا کہ اصل میں کیا حرج ہے۔ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرلیا جائے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمادیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ نیت کا اعتبار ہے۔ آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔

سوء خاتمہ کا اندیشہ

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں

(۱) ''یعنی ایک یا دو گھونٹ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی'' سنن ابی داؤد: ۲۰۶۳۔

اس کی لڑکی کے لیے پیام بھیجا۔اس نے کہا اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ تم رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرو۔ فقیہ نے اس شرط کو منظور کرلیا اور نکاح ہوگیا۔ اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا یا تو انہوں نے اس کو سن کر سر جھکالیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے۔اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدوں اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لیے اس کو چھوڑ دیا۔

لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہوگئی ہے۔ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پاویں گے اختیار کرلیں گے۔ مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابوحنیفہ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔سو یہاں تو یہ شخص شافعی کا مذہب اختیار کرلے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگادیا تو اب شافعی کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور حنفیہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا۔ حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک بھی وضو نہیں رہا امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی صاحب کے نزدیک عورت کو چھونے کی وجہ سے مگر اس شخص کو اس کی ذرا پروانہ ہوگی۔ ہر امام کی رائے وہ اسی میں قبول کرے گا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا۔سو دین تو رہے گا نہیں غرض پرستی رہ جائے گی۔ پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تدین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے۔

تقلید شخصی کی ضرورت

بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی ہے۔ ہم سہولت پسند اور غرض کے

بندے ہیں۔ اس لیے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں۔ سو ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اور ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط (زیادہ احتیاط والے) کو تلاش کر کے عمل کریگا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کریگا تو غرض پرستی میں پڑ جائے پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء اخیار (نیک) میں سے ایک ہی کو متعین کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں میں غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے۔ پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا اور اس اختلاف علماء ہی کی وجہ سے اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا اس اختلاف علماء ہی کی وجہ سے عام لوگ یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کی جدا رائے ہے ہم کدھر جائیں مگر اس کا تو میرے پاس ایسا جواب ہے کہ اس کا کسی سے رد ہی نہیں ہوسکتا۔

وہ یہ کہ طبیب کے پاس بھی تو آخر جاتے ہیں ان میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہی ہے۔ تو جس طرح ان کاموں میں ایک کو منتخب کر لیتے ہو اسی طرح یہاں کیوں پریشانی ہے کہ کس کا کہنا مانیں۔ اس کا بھی یہی انتظام کر لو کہ ایک عالم اور ایک شیخ کو منتخب کر لو پس ہر شخص کو اکثر دو آدمیوں کے متعین کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ایک عالم کی اور ایک شیخ کی کیونکہ کئی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک اعمال

صالحہ اور ایک اس کی تکمیل کی۔ پس دو شخصوں سے تعلق پیدا کرو۔ عالم سے تو اعمال صالح سیکھو اور شیخ سے اس کی تکمیل کرو اور اگر کوئی جامع مل جائے جس سے دونوں چیزیں حاصل ہو جائیں تو خوش قسمتی ہے اگر پریشانی سے اپنی نجات چاہتے ہو تو ایسا کرو اور اس کی ہی سخت ضرورت ہے۔

پھر ہر ایک امر میں جو شبہ ہو اس سے پوچھ لو۔ جو کام کرنا چاہو پہلے اس سے پوچھ لو اگر وہ جائز بتلائے تو کرو ورنہ نہیں اور یہ بھی سمجھ لو کہ باتیں دو قسم کی پوچھی جاتی ہیں۔ ایک تو احکام دوسرے اس کے دلائل جو بات وہ بتلائے اگر اس کی دلیل تمہاری سمجھ میں نہ بھی آئے تو تب بھی اس شخص کی اطاعت نہ چھوڑو بلکہ اس کی بات بلا دلیل مان لو۔ دنیاوی امور میں بھی عقلاء کا یہی طریقہ ہے۔ آخر سول سرجن کا قول مان لیتے ہو کچھ اگر مگر نہیں کرتے تو دلیل نہ سمجھ میں آئے۔ اسی طرح دین میں جس کو متبوع قرار دو اس سے زیادہ گڑ بڑ نہ کرو زیادہ محقق نہ بنو عمل کرو اگر محقق بننے کا شوق ہو تو مدرسہ میں آکر پڑھو۔ غرضیکہ ایک شخص کو متبوع مقرر کر لینے میں بہت پریشانیوں سے بچ جاؤ گے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے اس مسئلہ مختلف فیہا(۱) کا جو آج کل بہت معرکۃ الآراء (۲) سمجھا جاتا ہے فیصلہ کیا ہے اور دونوں مرضوں کا علاج کیا ہے۔ خودرائی کا بھی اور عدم معیار کا بھی۔ جس کا حاصل وہ ہے کہ اتباع کرو سبیل حق کا مگر بواسطہ من اناب الی (ان لوگوں کے جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے) کے اور گو ''من اناب'' میں متعدد اشخاص کے اتباع کرنے کا مضائقہ نہ تھا لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایک متعین کر لینے میں راحت اور انتظام اور نفس کی حفاظت ہے۔ پس اس زمانہ

(۱) اختلافی مسئلہ (۲) جو آج کل بہت بڑا سمجھا جا رہا ہے۔

میں علماء اور مشائخ کو اس جانچ سے جانچئے اگر کوئی جامع مل جائے تو ایک کو، ورنہ دو کو منتخب کر کے ان کا اتباع کیجئے۔

اگر دین پر چلنا چاہتے ہو تو اسکا یہ طریقہ ہے ورنہ بدوں اس کے آج کل دین سالم رہنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ جو شخص اس طریقہ کے خلاف کرے گا کچھ تعجب نہیں کہ وہ دین سے بہک جائے۔ میں نے ایک ایسی بات بتلادی ہے کہ عمر بھر کے لیے دستور العمل بنانے کے قابل ہے اور جو اس پر عمل کرے گا اس کو کبھی گمراہی نہ ہوگی۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلی اللّٰہ تعالی علی خیر خلقه محمد واله واصحابه اجمعین واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔(۱)

(۱) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو وعظ کو سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۷/۷/۲۰۱۷

چار شرطیں لازمی ہیں استفاضہ کے لیے
اِطلاع واتباع واعتقاد وانقیاد

یہ مقفّی قول ہے رنگین بھی سنگین بھی
حضرت مُرشد کا یہ ارشاد رکھ تا عمر یاد

مجذوب رحمۃ اللہ علیہ

راہبر تو بس بتادیتا ہے راہ
راہ چلنا راہرو کا کام ہے

تجھ کو مُرشد لے چلے گا دوش پر
یہ ترا راہرو خیالِ خام ہے

مجذوب رحمۃ اللہ علیہ